DR. H.J KARIM BAKHSH WITTEVEEN

عالمی شہرت یافتہ اقتصادی و معاشی ماہر، عالمی مالیاتی ادارے کے سابقہ مینجنگ ڈائریکٹر
اور نیدرلینڈز کے سابقہ وزیر خزانہ کی لکھی ہوئی
عالمگیر شہرت کی حامل کتاب Universal Sufism کا اردو ترجمہ

عالمگیر تصوف

مترجم: جمشید اقبال

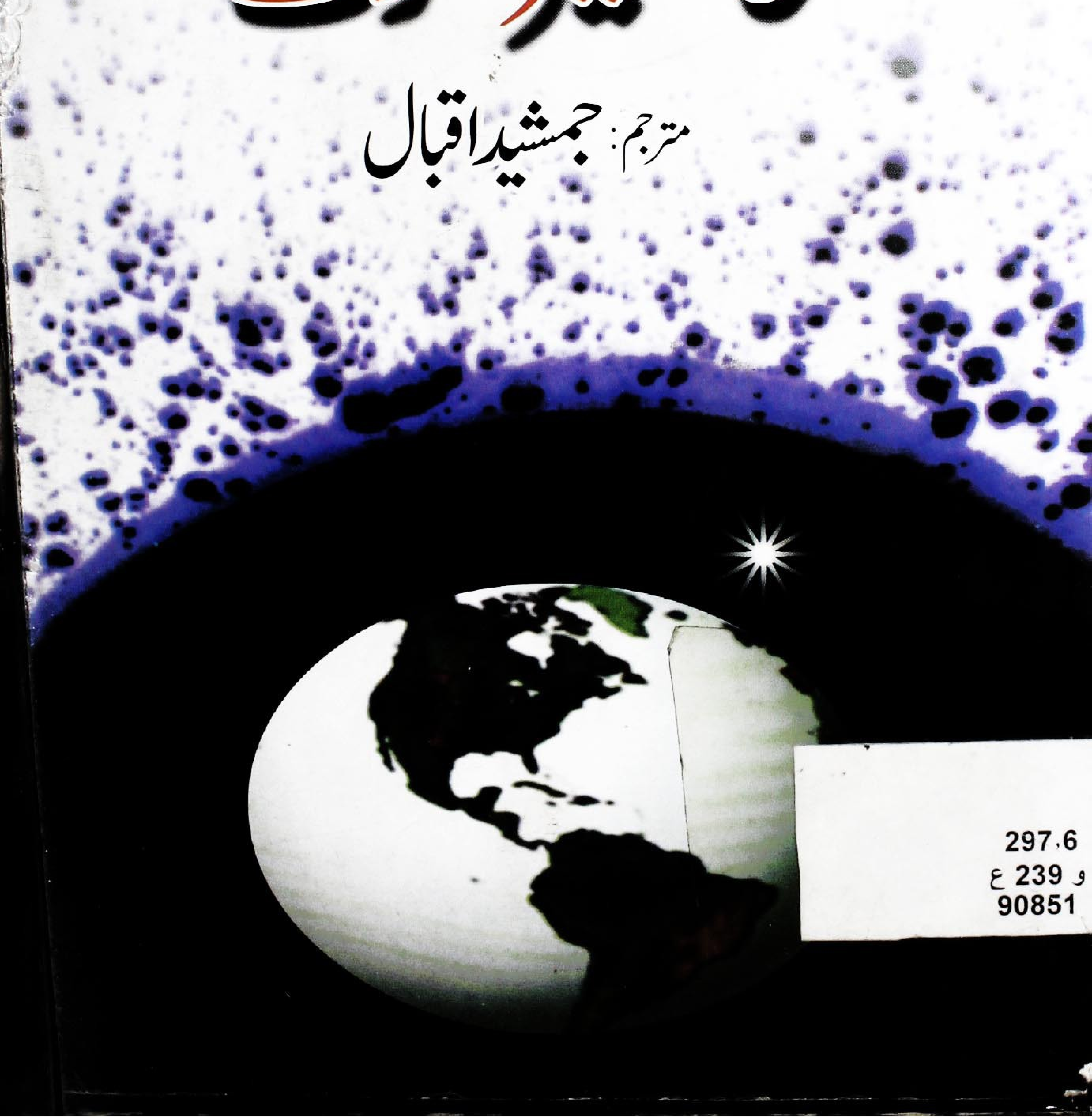

297.6
و 239 ع
90851

Marfat.com

ڈاکٹراتچ

میں نید

گھرا

سے

زندگ

بیعد

Marfat.com

عالمی شہرت یافتہ اقتصادی و معاشی ماہر، عالمی مالیاتی ادارے کے سابق مینیجنگ ڈائریکٹر اور
نیدرلینڈ کے وزیر خزانہ DR. H.J. Karim Bakhsh Witteveen کی
عالمگیر شہرت کی حامل کتاب "Universal Sufism" کا اردو ترجمہ

عالمگیر تصوف

مصنف: ایچ۔ جے۔ کریم بخش وٹوین

مترجم: جمشید اقبال

بیکن بُکس
BEACON BOOKS
• میاں چیمبرز۔3 ٹیمپل روڈ لاہور فون: 042- 6365721 6366079
• گلگشت کالونی، ملتان فون: 061-6520790-6520791
E-mail:beacon_books_pakistan@yahoo.com
E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com
Web: www.beaconbooks.com.pk

Marfat.com

کتاب "Universal Sufism" کا ترجمہ مصنف کی باقاعدہ تحریری اجازت سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا بیکن بکس کی تحریری اجازت لیے بغیر کہیں بھی شائع نہ کیا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو مصنف/ پبلشر کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔

297.6
۹۰۸۵۱

اشاعت : 2008ء

عبدالجبار نے
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان، لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/170 روپے
US $ 8.99

ISBN: 978 - 969 - 534 - 134 - 6

Acknowledgements

While I am solely responsible, if there are any stupidities and vagueness in this book. At the same time I would like to take this opportunity to thank Dr. Witteveen for his guidance on every step of getting this work published, Faiz Mohammad Qurashi for his patience and personal interest and Samina Khan (ED Sungi) for her kindness in granting me some time for this work.

Jamshed Iqbal

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

پیش لفظ 9

تعارف 11

باب 1

تصوف، نقطۂ آغاز اور تاریخ

1۔ مصری ہر یت پسندی اور تصوف 15

2۔ تصوف کے اسلامی فکر و تمدن پر اثرات 19

3۔ عارفانہ کلام 25

4۔ ہندوستان میں صوفیا کی آمد 33

باب 2

حضرت عنایت خانؒ

1۔ عہدِ طفولیت 36

2۔ ہندوستان کا سفر 41

3۔ روحانی تلاش 44

باب 3

مغرب میں تصوف

1۔ یادداشتیں 57

باب 4

عالمگیر تصوف، روحانی آزادی کا پیغام

عالمگیر تصوف، روحانی آزادی کا پیغام 64

باب 5

فلسفۂ تصوف

1۔ سائنس اور تصوف: مغربی اور مشرقی فکر 69
2۔ ارتعاش 70
3۔ روح اور مادہ 74
4۔ سلسلۂ تخلیق 80

باب 6

عالمِ ملکوت سے عالمِ ناسُوت تک

(نزول اور رجعت)

1۔ ملکوتی دنیا 86
2۔ جنات کی دنیا 88
3۔ مادی دنیا میں ظہور 89
4۔ ذہن کی خصوصیات 93
5۔ حصول کا راستہ 95
6۔ حیات بعد از ممات: مراجعت 99
7۔ ملکوتی دنیا میں واپسی 105

Marfat.com

باب 7

من و یزداں

1۔ خدا کے تصورات 107

2۔ خدائی تصور کا ارتقاء 112

3۔ انسان اور خدا 116

4۔ وحدتِ ادیان 117

باب 8

تصوف، وصلِ خداوندی کا راستہ

1۔ صوفیانہ واردات 120

2۔ روحانی تربیت 124

3۔ ذہنی پاکیزگی 130

4۔ انتقالِ دانش 134

باب 9

تہذیبِ اخلاق

1۔ اچھے اور بُرے کا مطلب 136

2۔ ارتقائے خُلق 138

3۔ نفسِ امّارہ پر قابو پانا 143

Marfat.com

باب 10

صوتی ارتعاش اور تصوف

1۔ ہم آہنگی اور تخلیق 150

2۔ آواز اور انسانی زندگی 152

باب 11

روحانی اور جسمانی صحت

1۔ جسم اور ذہن کا رشتہ 159

2۔ غیر طبی طریقۂ علاج 161

3۔ روحانی علاج 164

باب 12

عالمی امن، سماجی پہلو

1۔ باطنی امن 168

2۔ عارضی اور ابدی دنیا 172

3۔ اقوامِ عالم اور قیامِ امن 175

4۔ عالمگیر معاشی ہم آہنگی 178

5۔ مجوزہ اقدامات 180

6۔ عالمگیر مذہبی اقدار کے احیاء کی ضرورت 182

7۔ دُعائے امن 184

ماحصل 185

حوالہ جات 187

کتابیات 198

Marfat.com

پیش لفظ

یہ کتاب حضرت عنایت خانؒ کے صوفیانہ پیغام کے روحانی فیضان اور رحمتوں کا اعتراف ہے۔حضرت عنایت خانؒ کے روحانی پیغام نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔میں آج تک اُن کے صوفیانہ پیغام کا مطالعہ کررہا ہوں۔لیکن یہ مطالعہ روایتی اکتسابی مطالعہ نہیں ہے۔کیونکہ تصوف کو پڑھنا نہیں جینا پڑتا ہے۔تصوف داخلی اور خارجی دنیاؤں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا نام ہے۔میں نے ایک اقتصادی ماہر کے طور پر بھی حضرت عنایت خانؒ کے پیغام سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

کوئی انسان جب بھی کوئی اہم چیز پاتا ہے وہ اپنے دوستوں کو اس کے بارے میں ضرور بتاتا ہے۔میں روحانی پیغام سے حاصل کردہ روحانی دولت بانٹنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔یہ کتاب عالمگیر تصوف کا تعارف ہے۔صوفیانہ پیغام کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالنے کے لئے میں نے حضرت عنایت خانؒ کے ہی الفاظ کا سہارا لیا ہے۔کیونکہ حضرت عنایت خانؒ کے الفاظ اُن کے صوفیانہ تجربے کی صداقت کا یقین دلاتے ہیں اور ہمارے اندر روحانی تجربات کا شوق بیدار کرتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں۔۔میں اپنے کئی صوفی دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں کے گذشتہ کئی برسوں کے دوران میری بھرپور رہنمائی کی اور میں صوفیانہ پیغام کی گہری اور سادہ صداقت کو سمجھنے اور بیان کرنے میں کامیاب ہوا۔

سب سے پہلے میں اپنے والدین کا شکر گذار اور ممنون ہوں کیونکہ اُن کی بدولت مجھے صوفیانہ ماحول نصیب ہوا۔میرے والدین نے میرے بچپن میں ہی صوفیانہ تعلیمات کو نہایت سادگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنا شروع کردیا۔میں کافیہ بلاؤ روبرٹ سن (*Kafia Blaauw Robertson*) کا شکر گذار ہوں جنہوں نے بہت دلکش انداز میں پہلی بار مجھے صوفیانہ ریاضتوں کے عظیم تجربے سے آشنا کیا۔بعد میں مجھے حضرت عنایت خانؒ کے قریبی ساتھیوں اور صوفیائے کرام سے براہِ راست فیض پانے کا موقع ملا۔حضرت عنایت خانؒ کے ان

Marfat.com

ساتھیوں میں محمد علی خان، مشرف علی خان اور حضرت عنایت خانؒ کے پوتے فضل عنایت خان شامل ہیں۔ بعدازاں مجھے بین الاقوامی صوفی تحریک کے قائدین میں شامل کرلیا گیا اور مجھے عظیم الشان شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنی ساری زندگی حضرت عنایت خانؒ کی تعلیمات کے گہرے مطالعے اور صوفی تحریک کی مختلف سرگرمیوں کے لئے وقف کردی۔ میں اِس وقت صوفی تحریک کے لئے خدمات پیش کررہا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے صوفی تحریک کے موجودہ قائد اور حضرت عنایت خانؒ کے دوسرے فرزند ہدایت عنایت خانؒ کا فیضان پرور تعاون حاصل ہے۔ یہاں مجھے تصوف کے موضوع پر ترغیب آفریں گفتگو کا موقع ملا اور حضرت عنایت خانؒ کے کئی مریدوں کا قرب حاصل ہوا۔ میں اپنی شریکِ حیات رتن کا خصوصی طور پر شکرگذار ہوں جنہوں نے اِس کام میں ہمیشہ میری مدد کی ہے اور روحانی راستوں پر بھی میری ہمسفر رہی ہیں۔

اس کتاب کے سلسلے میں برسلز میں شائع ہونے والے میگزین ''تقدم'' کے مدیرِ اعلیٰ لیونارڈ ایل کا شکرگذار ہوں جنہوں نے سب سے پہلے اس کتاب کا آئیڈیا دیا۔ شیخ المشائخ مخدوم خان کا بھی خصوصی طور پر شکرگذار ہوں جنہوں نے کلاسیکل تصوف کا دقتِ نظری سے مطالعہ کیا اور اِس کتاب کے پہلے باب کی تکمیل میں میری بھرپور رہنمائی فرمائی۔ اس کتاب کے پہلے باب (تاریخِ تصوف) کی تکمیل میں ان کی بھرپور مدد پر میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تاہم ان کا یہ تعاون جس انداز و تعبیر سے منظرِ عام پر آیا ہے اُس کا میں خود ذمہ دار ہوں۔

میں اپنے معتمدین مس ریا سائمپمن، مس پاٹریکا میوس، اور مس ڈورین ڈی یونج کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے مسودے کو کمال دیانتداری سے ٹائپ کیا۔ آخر میں میں اپنے انگریزی ایڈیٹر جیس کرٹس کا ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کے زبان واسلوب کے بارے میں کئی مفید مشوروں سے نوازا۔

تاہم میں اس بات سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ صوفیانہ پیغام کے بیان کی کوئی بھی کوشش جامع نہیں ہوسکتی۔ تصوف الفاظ اور تصورات سے ماورا ہے۔ کیونکہ تصوف نہ کوئی نظریہ ہے اور نہ ہی عقیدہ۔ یہ ایک طرزِ حیات ہے۔۔ ایک رویہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اور پہچان گہرا اطمینان اور بحر آسا سکون ہے جو صرف حقیقت کی انفرادی رمزکشائی کے بعد ملتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایسی ہی طمانیت میرے الفاظ کے پردوں کو چیر کر آپ پر بھی عیاں ہوسکتی ہے۔۔ جو الفاظ وتراکیب سے عظیم تر ہے۔

تعارف

13 ستمبر 1910 عظیم ہندوستان صوفی اور موسیقار حضرت عنایت خانؒ بمبئی سے ایک کشتی کے ذریعے امریکہ کے لئے روانہ ہوئے۔اس سفر میں ان کے چچازاد بھائی محمد علی خان اور بھائی محبوب خان بھی اُن کے ساتھ تھے۔اُن کا مقصد مشرق اور مغرب کے درمیان وسیع وعریض فکری وعملی فاصلوں کو مٹانا اور امریکہ کو باطنی دانش سے روشناس کرنا تھا۔ان کا مقصد بلند مگر راستہ کٹھن تھا۔تاہم انہیں رحمتِ خداوندی اور خلوصِ ذات کا فراہم کردہ یقین حاصل تھا۔

امریکہ اُن کے لئے مکمل طور پر اجنبی دنیا تھی۔یہاں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس سے وہ پہلے سے واقف ہوں۔اُس وقت امریکہ اپنے ہم عصر ہندوستان سے کلیتاً مختلف تھا۔انہوں نے امریکہ کا گہرا مشاہدہ کیا۔یہاں کے لوگوں کے چہروں پر لکھے ہوئے سوالات پڑھے۔اُنہوں نے ابتدا میں،اُن تمام سوالات کے جواب دیے جو اُس دور کے مغربی ذہن میں اٹھ رہے تھے اور بعد ازاں اُن اذہان کو سوالات سے ماورا اور آزاد ہونے کے روحانی قرینے سے آگاہ کیا۔اس دوران انہوں نے قدیم صوفیانہ دانش کو جدت سے ہم کنار کیا اور اِسے ایک عالمگیر اخلاقی وروحانی ضابطے کے طور پر متعارف کروایا۔عالمگیر تصوف اپنے ماخذ (اسلامی پس منظر) سے ابھرتا ہے اور حضرت عنایت خانؒ پر آکر عقلی وتجزیاتی علوم کی دھاراؤں کو بھی اپنے اندر ضم کر لیتا ہے۔

عالمگیر تصوف موجودہ دور کی علمی،فکری،روحانی اور اخلاقی ضروریات کا تسلی بخش جواب فراہم کرتا ہے۔ایک ایسے دور میں جب فاصلے سمٹ رہے ہیں اور دنیا بھر کی ثقافتوں میں قرب وربط کے موسموں کا راج ہے۔۔مذاہب عالم کے درمیان اتحاد وہم آہنگی اور باہمی تفہیم کی اشد ضرورت ہے۔اس مقصد کے لئے حضرت عنایت خانؒ نے عالمگیر عبادت کے سلسلے کا آغاز کیا جس کے ذریعے تمام عظیم مذاہب کے پیروکار ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ایک خدا کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں (ملاحظہ فرمائیں باب نمبر 7)۔حضرت عنایت خانؒ نے ہمیں

Marfat.com

بتایا ہے کہ دنیا کے تمام عظیم مذاہب کے پیغامات میں گہری مماثلت موجود ہے۔ اُن کے نزدیک ہر سچا مذہب خدا کے فضل و کرم کا ثبوت ہے جو انسان کی مختلف ادوار میں روحانی ضروریات پوری کرنے کے لئے محبت کرنے والے دلوں پر اتارا گیا ہے۔ یہ تمام مذاہب مختلف ادوار میں مختلف ثقافتوں سے ہم آہنگ تھے۔ ان تمام مذاہب کی شکلیں ضرور مختلف ہیں۔۔ لیکن یہ سب ایک ہی منزل تک لے جانے کے راستے ہیں۔

سائنسی و تجزیاتی علوم کی دنیا جہاں مذہبی روایات سے اور مذہبی عقائد سائنسی نظریاتِ حیات سے متصادم ہیں وہاں عالمگیر تصوف روحانی نظریہ حیات پیش کرتا ہے۔ عالمگیر تصوف ایک طرف جدید سائنسی علوم سے متصادم نہیں ہے تو دوسری طرف مذاہب اور روحانی اصولوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کی صوفیانہ تعلیمات کی اہمیت اس حقیقت پر قائم ہے کہ انہوں نے قدیم تصوف کو جدت سے ہم کنار کرتے ہوئے تخلیق و اجتہاد اور کہنہ روایت کو یکجا کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے تصوف کو ایک عالمگیر اخلاقی و مذہبی ضابطے کے طور پر پیش کیا ہے۔ عالمگیر تصوف وہی اخلاقی و روحانی ضابطہ ہے جو آج کے انسانی شعور کی اہم ترین ضرورت ہے۔ (پانچواں باب ملاحظہ فرمائیں)

آج کی اہم ضرورت یہ ہے کہ دورِ حاضر کا انسان مراقبے کے ذریعے باطنی دنیا سے ایک بار پھر آشنا ہو سکے۔ صوفیانہ سلاسل نے ہمیشہ اُن پرخلوص لوگوں کی رہنمائی اور تربیت کی ہے جو روحانی صداقتوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ صوفیائے کرام کی رہنمائی اور تربیت نے صدیوں سے خدا کی تلاش میں نکلے ہوئے عُشاق کے قافلوں کو سیدھی راہ دکھائی ہے اور منزل تک پہنچایا ہے۔ اس مقام پر حضرت عنایت خانؒ قدیم صوفیانہ دانش سے بھرپور استفادہ حاصل کرتے ہوئے صوفیائے کرام کی اصطلاحات اور روحانی بیداری کے طریقوں کو آج کی جدید نسل تک پہنچاتے ہیں۔ ہمارا مقصد عالمگیر صداقت تک پہنچنے کے لئے ہمیں ایک خاص روحانی ضابطے کا انتخاب کرنا ہے۔ مختلف طریقہ ہائے کار کو مجتمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ حضرت عنایت خانؒ نے اپنے ذاتی روحانی تجربے کے بل بوتے پر روحانی ریاضتوں کو جدید مزاج عطا کیا ہے۔ لہٰذا ساتویں صدی سے قائم و دائم روحانی روایات میں حضرت عنایت خانؒ نے ایک نئی روح پھونکی ہے۔ اس لئے ہم انہیں نہ صرف دورِ جدید بلکہ دور بعد از جدید کا عظیم روحانی پیشوا مانتے ہیں۔

حضرت عنایت خانؒ نے جاگنے کے لئے بھاگنے کو شرط قرار نہیں دیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم دنیا سے کنارہ کشی اختیار کیۓ بغیر باطنی دولت کے حصول کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ دنیا سے بھاگنے کے برعکس حضرت عنایت خانؒ کی تعلیمات ہمیں دنیوی فرائض کی ادائیگی کا احساس دلاتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ دنیوی فرائض کی ایماندارانہ بجا آوری بھی ہمیں جگا سکتی ہے۔ عالمگیر تصوف دنیوی زندگی کو مثبت روشنی میں دیکھنے کا درس دیتا ہے۔۔ کیونکہ دنیا ہی وہ مقام ہے جہاں ہم الوہی واردات کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی دنیاؤں کا ربط اور ہم آہنگی ہی صوفیانہ نصب العین ہے۔ (آٹھواں باب ملاحظہ فرمائیں)

اس کتاب کا پہلا باب ہمیں تصوف سے روشناس کراتا ہے۔ اس باب میں ہم اسلامی تصوف کو تاریخ کے مختلف ادوار میں ارتقاء پذیر پائیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تصوف قدیم مصری سریت پسندی سے جنم لیتا ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے عظیم مسلمان صوفیائے کرام کے روحانی افکار اور خالص الہامی انوار و فیوض کی دولت سمیٹ کر ایک جامع اور عملی نظریہ حیات بن جاتا ہے۔ اس باب کے آخر میں ہم ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی تاریخ پر بھی بات کریں گے کیونکہ عظیم صوفی رہنما حضرت عنایت خانؒ کا تعلق بھی اسی روحانی سلسلے سے ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا مرکزی نقطہ حضرت عنایت خانؒ ہیں۔۔ وہ ماحول جس میں انہوں نے پرورش پائی۔ اُن کی موسیقی۔۔ روحانی راستوں کی تلاش اور آخر کار امریکہ کا سفر۔۔ یہ سب اس باب میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ اس باب میں آپ کو مغرب میں ان کی تعلیمات کی مختصر جھلک ملے گی۔ اُن کے صوفیانہ پیغام کے ذائقے سے قارئین کو روشناس کرانے کے لئے ان کے کچھ مریدوں کے تاثرات کو بھی اس باب میں خصوصی جگہ دی گئی ہے۔ دیگر ابواب میں صوفیانہ پیغام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اکثر مقامات پر حضرت عنایت خانؒ کے اپنے ہی الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اُن مقامات پر خصوصی روشنی ڈالی گئی جہاں حضرت عنایت خانؒ کی خالص الہامی تعلیمات موجودہ دور کی فکر اور علوم سے ہم آہنگ بلکہ بہت آگے نظر آتی ہیں۔

کتاب کا آخری باب عالمی امن کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے۔ موجودہ دنیا کو امن اور ہم آہنگی سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم عالمی سطح پر پائیدار امن کا قیام نسلِ انسانی

Marfat.com

کے روحانی ارتقاء کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ صرف اسی ارتقاء کے طفیل ہی انسان اپنے محدود شعور کو بحر آشنا کر سکتا ہے۔ روحانی ارتقاء کی دولت ہی نسلِ انسانی کو تقسیم اور حدود پرستی سے ماورا کر سکتی ہے۔ امن پر خلوص دلوں میں جنم لیتا ہے اور دلوں کو خالص بنانا ہی تصوف کا نصب العین ہے۔
میری خدا سے دعا ہے کہ میری یہ ادنیٰ سی کاوش صوفیانہ پیغام کے نصب العین (عالمی امن اور ہم آہنگی) کے فروغ کے لئے معاون ثابت ہو!

آمین!

Marfat.com

باب 1

تصوف' نقطۂ آغاز اور تاریخ

1۔ مصری سِرّیت پسندی اور تصوف:

تصوف کا لفظ یونانی لفظ ''سوفیہ'' سے گہرے صرفی مراسم رکھتا ہے۔ سوفیہ یونانی زبان میں دانش اور حکمت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تصوف عربی زبان کے الفاظ صوف یا صفا سے مشتق ہے۔ اس طرح صوفی وہ ہے جسے خداوندِ کریم نے دل کی صفائی بخشی ہو اور اُس نے اپنے اخلاق و عادات کو سادہ، مہذب اور شائستہ بنالیا ہو۔ عربی زبان کے لفظ ''صوف'' کی نسبت سے دیکھا جائے تو صوفی سے مراد وہ شخص ہے جو تعیش سے مزاحم ہو اور دین کی اصل سادگی پر کاربند ہو۔

یہ تمام الفاظ ایک خاص الوہی دانش اور روحانی تعمیر و تطہیر کے عکاس ہیں۔ یہ دانش، یہ جذبۂ تعمیر و تطہیر خالص شعور میں جنم لیتا ہے اور خالص شعور اُس وقت جنم پذیر ہوتا ہے جب شعور سے زمانی و مکانی کثافتوں کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ جب شعور اِس بوجھ سے آزاد ہوتا ہے تو دل کی حکمت کا جنم ہوتا ہے اور یہ حکمت قوتِ فکر کی مدد سے حاصل شدہ تجزیاتی علم سے عظیم تر ہے۔

حضرت عنایت خانؒ نے اپنے روحانی سلسلے کو ''سلسلۂ خلوص'' (Order of Purity) کہا ہے۔ تصوف میں نظامِ اتباع ہمیشہ اہم رہا ہے جس میں روحانی صداقتوں کے متلاشی (مرید) اور روحانی معلم (شیخ یا مرشد) کے درمیان ذاتی و جذباتی تعلقات کا استوار ہونا ضروری ہے۔ مراقباتی خاموشی میں جنم لینے والی روحانی تجلی حقیقت کی حقیقت تک شعورِ انسانی کی رسائی کو ممکن بناتی ہے۔ اور اس خالص ترین تجربے کو الفاظ اور نظریات کی شکل دینا ناممکن ہے۔

Marfat.com

ماضی میں روحانی دانش روحانی معلم سے مریدین تک ذاتی وجذباتی تعلقات کے بل بوتے پر منتقل ہوتی رہی ہے۔ بالفاظِ دیگر روحانی دانش کے منتقل ہونے کے لئے موزوں وقت وہ ہے جب شیخ اور مرید کے درمیان دل کا رشتہ قائم ہو اور باقی تمام بندھن چھوٹ جائیں۔ ہم اس صوفیانہ روایت کو قدیم ادوار میں بھی دیکھتے ہیں۔ یورپین اور اسلامی تحقیق اس بات پر متفق ہے کہ عہدِ عتیق میں سری دانش نے مصر میں جنم لیا تھا اور ہرمیانی کتب کو متصوفانہ دانش کا قدیم ترین نمونہ کہا جا سکتا۔ ہرمیانی مقدس کتب ہر میس ٹریس میجیٹس * سے منسوب ہیں۔ ہرمیانی مقدس کتب کی تعلیمات فیثاغورث اور نوفلاطونی فلسفیوں اور دینِ عیسوی کے ماننے والے سریت پسندوں کے ذریعے دنیا بھر میں پھیلیں جنہیں ہم قدیم تصوف کہہ سکتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے قدیم تصوف اور اسلامی کلاسیکی تصوف کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے، مستند مستشرق آر۔ اے۔ نکلسن کے بقول، ''تصوف کو اسلامی تاریخ میں ایک واضح شکل دی''[1]۔ حضرت ذوالنون مصری نیوبا کے باشندے اور ہرمانی صوفی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مصر کی قدیم ترین علامتی تحریروں کا بھی علم رکھتے تھے۔ قدیم مصر کا باطنی علم سب سے پہلے دینِ عیسوی میں شامل ہوا اور بعد ازاں اسلام تک پہنچا[2]۔

ذوالنون مصریؒ نے دیکھا کہ کائنات کے ذریعے خدا اپنا اظہار کر رہا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری کا یہ الہام فلسفہ وحدت الوجود کا بلیغ اظہار ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ مندرجہ ذیل دعا میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں:

> ''اے خدا۔۔ میں نے پتوں کی سرسراہٹ، پانی کے بہاؤ کے ترنم، پرندوں کے گیتوں، ہواؤں کی سرگوشیوں، بادلوں کی گھن گرج کو نہیں سنا (بلکہ مجھے ان سب میں) آپ کی وحدانیت کی شہادت سنائی دی ہے۔ مجھے یقین ملا ہے کہ تمہارا ہمسر کوئی نہیں ہے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔۔ تو علیم الخبیر ہے۔ تو حکیم ہے۔ تو منصف ہے۔ تو حق ہے۔ تو بے خبری اور ناانصافی سے پاک ہے۔ اے خدا۔۔ اے عظیم صانع۔۔ میں آپ کی تخلیق میں آپ کا جلوہ دیکھ سکتا ہوں۔ اے خدا مجھے ہمت دے کہ میں اپنی

---

* یونانی دیوتا thoth کا نام۔ لفظی مطلب سہ بار عظیم ترین۔

Marfat.com

خوشی میں آپ کی خوشی تلاش کروں۔ میں آپ کی خوشی بن جاؤں۔ جس طرح ایک بیٹا باپ کی خوشی بن جاتا ہے۔ میں آپ کی محبت میں آپ کو یاد رکھوں۔۔کیف آور طمانیت اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ"۔[3]

ذوالنون مصریؒ اس کے بعد اپنے پاک محبوب کی محبت میں گاتے ہیں۔ اُن سے قبل حضرت رابعہ بصریؒ پر عشقِ حقیقی نے معرفت الہام کی تھی بالکل اُسی طرح عشق میں بھیگے ہوئے ذوالنون مصریؒ پر کشف والہام کی بارش ہو رہی ہے:

"میں خالی ہوں لیکن میرے اندر آپ کی محبت کی خوشبو لافانی ہے۔ آپ کی محبت ہی میری روح کا مرض ہے۔ آپ کی محبت ہی میری روح کا علاج ہے۔ صرف آپ کے لئے ہی میری روح پکارتی ہے اور آپ ہی میری خواہش کا جنم ہوا اور آپ ہی انجام۔ آپ کی محبت کا خزانہ ختم نہیں ہو سکتا اور میری جھولی میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں سب کچھ لے لوں۔ میں اپنی دعاؤں میں آپ ہی کی طرف لوٹتا ہوں اور آپ ہی کو اپنا آخری آرام مانتا ہوں۔ آپ ہی میری آہوں کا شور سن سکتے ہو۔ آپ ہی میری سوچ کے خفیہ گوشوں کے مکین ہو"۔[3]

ہرمیانی دانش، جس نے حضرت ذوالنون مصریؒ کو متاثر کیا، اہرامِ مصر سے بھی قدیم تر ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے دورِ عروج میں یہ روایت مشہور تھی کہ مصری روحانی شخصیات کے سینوں میں خفیہ دانش کے خزانے دفن ہیں۔ اور یہ دانش کم وبیش وہی تھی جسے آج ہم تصوف کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اِس دانش کی بنیاد اِس عظیم راز پر تھی کہ "سب ایک ہے۔۔ایک سب ہے"۔

مصر کے قدیم علوم کا ماہر ہو یانگ درج ذیل مصری تحریر کا حوالہ دیتا ہے:

"خدا ایک ہے۔ اور صرف وہی "ہے"۔ اُس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔
خدا ایک ہے جس نے ہر شے بنائی ہے۔۔
خدا روح ہے۔۔روحِ مستور۔۔روحِ محجوب۔ روح الارواح ہے۔
خدا ابدی ہے۔
خدا محجوب ہے اور اُس کی کوئی شکل نہیں ہے۔
کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اُسے نہ دیکھا ہو۔

Marfat.com

اُس کا کوئی نام نہیں ہے۔اور اُس کے نام بے شمار ہیں۔
وہ سچ ہے۔۔وہ حقیقت ہے اور حقیقت میں ہی مقیم ہے۔
اُسی نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے۔
وہی ماں ہے۔۔وہی باپ ہے۔
خدا ہی ہستی ہے۔۔جو مکمل ذات ہے۔
خدا وہ ہے جس نے کثرت میں اپنا اظہار کیا ہے۔
خدا زمینوں اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔وہی تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔
خدا نہایت مہربان ہے۔کمزوروں کا نگہبان ہے اور ان کی فریاد سنتا ہے جو اُسے پکارتے ہیں۔
وہ عادل ہے۔وہ کریم ہے۔
وہ اُسے پہچانتا ہے جو اُسے پہچان لیتا ہے۔خدا اُسے پہچانتا ہے جو اُس کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔
وہ اُس کی حفاظت کرتا ہے جو اُس کا چلن اپناتا ہے''۔[4]

ہویانک کا خیال ہے کہ اِس عبارت کا اسلوب عین وہی ہے جو عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کا اسلوبِ کلام ہے۔حضرت عنایت خان قدیم مصری اور سامی مقدس کتب کے رشتوں کی رمز کشائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب ابراہیمؑ مصر سے مقدس کتب کا علم حاصل کرنے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے مکہ میں قیام کیا۔مکہ میں انہوں نے باطنی علوم کی یادگار کے طور پر ایک پتھر نصب فرمایا اور ابراہیمؑ کی گنگناتی ہوئی روح کا نغمہ اِس پتھر میں بس گیا۔یہ نغمہ آج بھی اُن لوگوں کو سنائی دیتا ہے جو سُن سکتے ہیں۔پیغمبروں نے کعبہ کے اس پتھر کی زیارت کو اپنا شیوہ بنایا اور وہ آواز سنی جو اِس میں گونج رہی تھی''۔[5]

عہدِ عتیق کے ان صوفیوں کا مقصد ایک ہی تھا۔خدا کے ساتھ ایک ہو جانا۔ایک ہونے کے اِس تجربے کو پائی مینڈرز (قدیم مصری روحانی سلاسل کی تحریروں کی یونانی شکل) میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"خدا کا جو علم انسان حاصل کرتا ہے اُسے الوہی خاموشی کہا جا سکتا ہے۔
اِس خاموشی کا تجربہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان حواس کے تمام
دروازے بند کر دیتا ہے۔۔ جب انسان حسیات کے عارضی تجربات
سے دُور نکل جاتا ہے۔ جسمانی حرکت تھم جاتی ہے اور روح (nous)
پر سکون ہو جاتی ہے۔ اور جب خدائی حسن کی جھلک انسان کی روح پر
پڑتی ہے۔۔ اس کے اثر سے انسان ہستی کی حقیقت تک رسائی حاصل
کر لیتا ہے"۔[6]

مندرجہ بالا اقتباس گہرے صوفیانہ تجربے کو بیان کرتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کا بیان کردہ روحانی تجربہ بہت حد تک اسی الوہی خاموشی کی خبر دیتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ عہدِ عتیق میں مذہب کا جنم مصر میں ہوا تھا۔ اِس لئے ہم قدیم مصر کو انسانی ہستی کے صوفیانہ پہلوؤں کا دل کہہ سکتے ہیں۔ مصری ہرمانیت کو ہم سریت پسندی کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ کے نزدیک اہرامِ مصر اسی تاریخی حقیقت کا پراسرار تعمیراتی اور علامتی اظہار ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اہرامِ مصر ایک خاص روحانی بلندی کو چھو رہے ہیں۔ اہرامِ مصر روحانی دور کی یادگار ہیں۔ اور جو کچھ اُس دور کے مصریوں نے کیا اس میں میکانیکی طاقت کا کوئی کمال نظر نہیں آتا۔ یہ سب روحانی طاقت کا کرشمہ ہے۔ اس لئے اہرامِ مصر کی عمر بہت لمبی ہے۔[7]

2۔ تصوف کے اسلامی فکر و تمدن پر اثرات:

قرآنِ مجید نے قدیم مصری سری روایات میں نئی روح پھونکی اور اِنسانیت کو ذاتِ خداوندی سے ازسرِ نو رشتہ استوار کرنے کی راہ دکھلائی۔ قرآنِ مجید نے انسان کے دل میں خدا کی تلاش کے جذبے کو ایک بار پھر زندہ کیا۔ اسلامی تصوف کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں بھی صوفیانہ دھارنائیں موجود تھیں اور یہ سب دھارنائیں مشرقِ وسطیٰ میں ایک ہی سمندر میں گرتی دکھائی دیتی ہیں۔ عالمگیر تصوف، تصوف کی وہ عالمگیر شکل جسے حضرت عنایت خانؒ نے مغرب میں متعارف کروایا، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں موجود صوفیانہ تحریکوں کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ اِن میں خاصی دل چسپی لیتا ہے۔ کیونکہ یہ عالمگیر مذاہب کی روحانی تحریکوں کا سنگم ہے اور یہی اِس کی عالمگیریت کا راز ہے۔

Marfat.com

اس ضمن میں یہ مناسب نظر آتا ہے کہ ہم اِس مقام پر عظیم صوفی بزرگ حضرت شہاب الدین یحییٰ سہروردیؒ (1151-91) کے بارے میں بات کرتے چلیں جنھوں نے دنیا بھر کے مذاہب کی روح کو سمجھا اور پھر اِن کے روحانی پیغام کو یکجا کیا۔ یہی وہ ہستی ہیں جنھوں نے تصوف کے پیغام کو واحد فلسفیانہ اور عملی روپ بخشا۔ حضرت شہاب الدین یحییٰ سہروردی کے نزدیک دنیا بھر کے متصوفانہ افکار میں ہرمیانی اور زرتشتی فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت زرتشتؒ نے جس مذہب کی بنیاد رکھی اُس میں خیر اور شر کے درمیان ازلی مخاصمت اور اندھیرے اور روشنی کے درمیان جنگ بنیادی روحانی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ حضرت شہاب الدین یحییٰ سہروردی نے حضرت زرتشت سے نورِ الٰہی کا تصور لیا اور اس پر اپنے صوفیانہ فلسفے کی بنیاد رکھی۔ اُن کی مشہور ترین کتب میں Philosophy of Illumination اور The Temple of Light بھی شامل ہیں۔ یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ بچپن میں حضرت عنایت خانؒ بھی چند پارسی علماء سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے کیونکہ جس علاقے (بارُودہ) میں وہ پیدا ہوئے تھے وہاں پارسیوں کی خاصی بڑی تعداد آباد تھی۔

حضرت شہاب الدین یحییٰ سہروردی کا مقصد دنیا بھر کے مذاہب کی روح کی تلاش تھی جس پر عالمگیر روحانی فلسفے کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ اِس طرح حضرت شہاب الدین یحییٰ سہروردی کم وبیش وہی کچھ کر رہے تھے جو مصر میں ہرمیز، یونان میں افلاطون اور ہندوستانی وایرانی مذہبی مفکرین نے کیا تھا۔

ہر وہ معاشرہ جہاں متصوفانہ فکر پروان چڑھی ہے۔۔ یہودیت کو روایتی مقام حاصل رہا ہے۔ کیونکہ یہودیت پہلا بڑا اسامی مذہب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے بلند پایہ پیغمبر کی شخصیت اور کردار دنیا بھر کے صوفیائے کرام کے لئے معیارِ کمال کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

> ''حضرت موسیٰ علیہ السلام عہد نامہ عتیق میں سب سے روشن پیغمبر ہیں۔ وہ عرب اور ایران کے شعراء کے بطلِ جلیل ہیں۔ فارسی شعراء اپنے کلام میں ان کا ذکر بالکل اُسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہندو رِشی اپنے کلام میں کرشن کو یاد کرتے ہیں''۔[8]

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام سینا کی چوٹی پر چڑھتے ہیں۔ چوٹی پر پہنچ کر وہ اس نورانی تجلی کا تجربہ کرتے ہیں جو اتنی طاقتور ہے کہ اُن کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ موسیٰ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو اندھیرا مٹ چکا ہے۔ وہ روحانی تنویر و تابش پا چکے ہیں۔۔ اب ہر ہستی کا ہر راز اُن پر کھل چکا ہے۔[9]

یہ تمثیلی واقعہ سامی مذاہب کی تینوں کتب میں موجود ہے۔ حضرت عنایت خان اس کی تفسیر کچھ یوں فرماتے ہیں:

> ''روحانی روشنی۔۔ روحانی دانش ممکن ہے کہ ایک پل میں حاصل ہو جائے۔ موسیٰ کے پہاڑ سے گرنے کا واقعہ ''میں نہیں ہوں۔۔ بس تو ہی ہے'' کا علامتی اظہار ہے۔ ہستی کا راز جاننے کے لئے مقامِ نیست سے گذرنا لازم ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہی فنا ہے۔ جب ایک انسان یہ جان لیتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو کچھ میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ یہ انکارِ نفس کا مقام ہے جسے ہندوؤں نے ''لایام'' اور بدھ نے ''تعدیم'' کہا ہے''۔

فنا، لایام یا تعدیم خام ذات کی موت ہے۔ اور خام ذات کی موت سے ہی خالص ذات کی رمز کشائی ممکن ہے۔ ایک مرتبہ ہم خام ذات کی دھول ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں ہم سرچشمۂ ہستی (خداوندِ کریم) کو اپنی شہ رگ سے بھی قریب پائیں گے۔۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ وہ محبوب ہمارے سامنے ہوگا۔۔ وہ محبوب جس کو پانے کے لئے ہم نے زندگی کا سُوت کا تا تھا۔[10]

تصوف پر مسیحی اثرات دراصل مشرقی مسیحیت کے راستے سے داخل ہوئے ہیں جو عرب فکر و مزاج کے عین مطابق تھی۔ مسیحی متصوفین اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کی روشن تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ کلاسیکی صوفیائے کرام اور مسیحی متصوفین نے روایتی بے نیازی اور ترکِ دنیا کو چھوڑ کر عشقِ الٰہی پر زور دینا شروع کیا تو اس جدید روحانی شعور نے تصوف کو جنم دیا۔ ہم اُس دور کے ہر مذہب میں اِسی قسم کی تبدیلیوں کو وقوع پذیر ہوتا دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ہر مذہب میں متصوفانہ تحاریک دراصل بے روح رسم پرستی کے خلاف مزاحمت کی صورت میں ابھری ہیں۔ اسلامی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صوفی کی اصطلاح پہلے پہل اُن مصفا دل ہستیوں کے لئے استعمال ہوئی جنہوں نے اسلام کی اصل سادگی پر قائم رہتے ہوئے تعیش اور تن پرستی کے رجحانات کے خلاف عملی

جہاد کیا تھا۔ اسی طرح مسیحیت میں صوفیائے کرام وہ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سادہ زندگی کو اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھتے تھے۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں صوفیانہ افکار و اعمال پر کسی ایک مذہب کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ہر عظیم مذہب کی تعلیمات کی مصفا و منزہ شکل ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا، جو بہترین عدل کرنے والا ہے، نے زمین کے چپے چپے تک اپنی ہدایت کی روشنی پہنچائی تھی۔ کسی ایک خطہ زمین، تہذیب یا تمدن کو منور نہ کرنا اُس کے انصاف کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دنیا بھر کے مذاہب میں اگر اختلاف ہے تو رسم پرستوں کے درمیان۔۔ دل کے مذہب کے ماننے والے حجت و نزاع کے فروعی اور سطحی مسائل میں الجھے بغیر اُس ذاتِ کریم پر نظر رکھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ نے صوفیانہ تصور کو مزید تقویت دی اور اُن کی شخصیت نے صوفیانہ طرزِ حیات پر گہرے اور طاقتور اثرات مرتب کئے۔ حضرت منصور حلاجؒ صدیوں سے صوفیانہ فکر و عمل کے تناظر میں اہم ترین شخصیت مانے جاتے رہے ہیں۔ 922ء میں انہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کیا تو رسم پرست مذہبی قوتوں نے اس عظیم حقیقت کے اعلان کے بدلے انہیں دار و رسن کا تحفہ دیا۔ جب وہ اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ خدا اور بندے کا درمیانی فاصلہ مٹ سکتا ہے تو اُن کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہی مثال تھی۔ اور انہوں نے اپنی سزا کو ایک عظیم و بلند منزل کے طور پر قبول کیا تھا۔ حضرت منصور حلاجؒ کا شمار، اسلامی تاریخ میں، اُن لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلمانوں میں جذبہ شہادت کو ابھارا۔ حضرت منصور حلاجؒ اپنے استاد (حضرت جنید بغدادیؒ) اور حضرت بایزید بسطامیؒ کی طرح سزا کے مستحق نہ ٹھہرتے اگر اُن کا نعرۂ مستانہ (انا الحق) رسم پرستوں کو سنائی نہ دیتا۔ اُس دور میں بغداد کی حکومت کے لئے اس قسم کا اعلان اس لئے بھی ناقابلِ برداشت تھا کہ بغدادی حکومت کسی ایسے عقیدے یا تصور کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جو عوام الناس اور ان کے قائدین کے عقائد سے متصادم ہو اور بدامنی کا باعث بنے۔ حضرت منصور حلاجؒ شہادت کے فلسفے کے عین مطابق سچی گواہی دے رہے تھے۔ بلاشبہ حلاجؒ کا یہ اعلان صوفیانہ واردات کی حقیقت کا اعلان تھا۔

منصورؒ کا اعلان حقیقت کے احساس کا ثمر تھا کہ خدا حقیقت ہے اور وہ واحد لاشریک ہے۔ وہ ہر جگہ برابر موجود ہے اور ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت کا بھی اعلان کر رہے تھے کہ جب تک ہم اپنے آپ کو محدود پہچانوں اور شناختوں کے

٩٠٨٥١

Marfat.com

تناظر میں دیکھتے رہیں گے ہم اپنے شعور کا رشتہ خدائی شعور سے جوڑنے میں ناکام رہیں گے۔ انسان مادی تعارفات سے جان چھڑائے بغیر وحدت کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا۔ حلاجؒ اس مقام کے لئے دعا گو تھے:

''اپنی لامحدود ذات سے میری محدود ذات مٹا دے۔ میری محدود ''میں'' نے مجھے اذیت کے سوا کچھ نہیں دیا''۔[11]

اور جب انہوں نے لامحدود شعور میں قدم رکھا۔۔ وحدت کی شراب پی لی۔۔ اپنے باطن میں سب سے بڑی حقیقت کو پالیا۔۔ اس کیف اور وجد میں وہ اور کیا کہہ سکتے تھے؟

اناالحق۔۔۔ اناالحق۔۔

جب انہیں سولی پر چڑھایا جارہا تھا تو انہوں نے چند عظیم روحانی حقائق سے پردہ اٹھایا:

''اے میرے عظیم رب۔۔ مجھے ہمت دے کہ میں اُس تمام کچھ کا شکریہ ادا کرسکوں جو کچھ آپ نے مجھے دیا ہے۔ جو کچھ آپ نے مجھے دکھایا ہے وہ دوسرے نہیں دیکھ پائے۔۔ یہ تجلی ہنوز اُن پر وا نہیں ہوسکی۔ آپ نے مجھے اِس قابل سمجھا ہے کہ میں تمہارے بحر آسا شعور میں ڈوب جاؤں اور تمہاری رفعتوں کا گواہ ٹھہروں۔۔ وہ نظارا جو دوسرے نہیں دیکھ پائے۔ اِس وقت تمہارے خادم۔۔ مذہب کے لئے پرجوش لوگ مجھے مارنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ان پر رحم فرما اور انہیں معاف کردے۔ کیونکہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے۔۔ وہ دیکھ لیتے تو آج میں سولی پر نہ لٹکایا جاتا۔ تمام تعریفیں تمہارے لئے ہیں۔ تمہارا ہر فیصلہ بلند اور اٹل ہے''۔[12]

اگرچہ صوفیانہ تعلیمات اور طرزِ زندگی پر دیگر مذاہب، مثال کے طور پر ہندومت اور بدھ مت، کے اثرات بھی موجود ہیں تاہم ان اثرات کا کھوج لگانا آسان نہیں ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ عظیم صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ نے نویں صدی میں اپنے مستند صوفیانہ تجربے کی بنیاد اپنشدوں پر رکھی۔ دراصل ان کی ملاقات سندھ کے ایک روحانی پیشوا* سے ہوئی تھی جو ویدوں کی روحانی روایات میں کامل تھے۔ اس لئے ہم

* ابوعلی سندھی سندھ سے عربستان گئے تھے۔ بایزیدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے فنا اور توحید کا علم سیکھا (حوالہ پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں از عبدالمجید سندھی، ص25) مترجم۔

Marfat.com

طور و اطوار ابتدا میں رومی کو نہایت عجیب معلوم ہوئے تاہم بعد ازاں انہوں نے شمس میں محبوب خداوندی کا مکمل عکس دیکھ لیا۔ اِس کے بعد کئی سال وہ ساتھ ساتھ رہے۔ شمس تبریزؒ نے انہیں کتابی و اکتسابی علوم سے آزاد کر دیا اور انہیں ''خبر'' اور ''نظر'' میں بنیادی فرق سمجھایا۔ ایک روایت کے مطابق شمس تبریزؒ نے رومی کی وہ تمام کتابیں کنویں میں پھینک دی تھیں جن پر رومی کئی برسوں سے کام کر رہے تھے۔ اس طرح شمس نے انہیں باطنی روشنی دکھائی اور اُن کے دل میں محبت کا بیج بویا۔ اس روحانی فیضان کا اثر یہ ہوا کہ رومیؒ الہامی دانش کے ساتھ ابھرے۔ ان کی حکایات اور تمثیلات میں عشقِ الٰہی کی لپٹ ہے۔ ان کا فیضان مستی میں جھومنے والے درویشوں میں نظر آتا ہے جو بے انائیت کے پر کیف لمحات میں رقص کرتے تھے۔ یہ رقص آج تک جاری ہے۔

رومیؒ نے ساری نظمیں کیف اور مستی کے عالم میں کہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری آج تک زمین پر بسنے والے کروڑوں لوگوں کے لئے فیضان اور روحانی سرمستی کا ایسا چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ اگرچہ اُن کی نظموں کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ اگر کوئی اُن کے علامتی نظام کو جان لے تو اِس سے عظیم و بلند شاعری کہیں نہیں پا سکے گا۔ رومیؒ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے دیدۂ دل وا کرنا لازم ہے۔ گوشِ باطن کو جگانا لازم ہے۔ رومیؒ کی شاعرانہ دنیا کی ''خبر'' پانے کے لئے اُن کے چند اقتباسات پیش ہیں۔ ان کا شہرہ آفاق کلام مثنوی بانسری کے بیان سے شروع ہوتا ہے:

''بانس کو سنو! یہ ایک کہانی سنا رہا ہے۔۔ جدائی کی کہانی۔ یہ کہہ رہا ہے:''
میں اپنی زمین سے جدا ہوا ہوں اور میری درد بھری آواز عورتوں اور مردوں کو رُلا رہی ہے۔ میں اپنا درد کسی ایسے سینے پر کھول سکتا ہوں جسے جدائی کے زخموں نے تار تار کر دیا ہو۔ میں صرف اسے اپنا راز سنا سکتا ہوں جس نے محبت کا درد سہا ہو! ہر وہ شخص جو اپنے محبوب سے دور کر دیا گیا۔۔ وہ اُس وقت میں واپس جانے کے لئے درد بھرا گیت گاتا ہے ۔۔ جب وہ اپنے محبوب کے پاس تھا۔

بانس میں محبت کی آگ ہے۔۔ شراب میں محبت کا کیف ہے مستی ہے۔ یہ بانس ہر اُس شخص کا ہمنوا ہے جو اپنے محبوب سے جدا ہوا ہے۔۔ اس کی

دُھن دل کو چیر رہی ہے''۔[16]

حضرت عنایت خانؒ رومیؒ کے اس اقتباس کی تشریح کچھ یوں فرماتے ہیں:

بانسری انسان کی روح ہے۔روح جو اپنی زمین۔۔اپنے گھر سے جدا کر دی گئی ہے۔ روح جس کا گھر خدا ہے۔بانسری کی آہ و بکا،ہم اسے سمجھ پائیں یا نہ سمجھ پائیں،اس دُکھ کا اظہار ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے جدا ہو کر بلا نام ونسب ہو چکی ہے۔اب وہ دوبارہ اپنے نام ونسب۔۔اپنی جڑوں کو واپس لینا چاہتی ہے جن سے وہ کاٹ کر جدا کر دی گئی تھی۔[17]

ایک اور مقام پر حضرت عنایت خانؒ اس تشریح میں اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انسان بھی اُس بانس کی مانند ہے جس کی جڑیں کٹ چکی ہیں اور اس میں چھید ہو چکے ہیں۔اس کا تنا مکمل ہے۔۔کُل ہے جبکہ بانس کا یہ ٹکڑا نامکمل ہے۔زندگی نے اس کے سینے میں چھید ڈال دیے ہیں۔اِن چھیدوں سے ہر وقت دکھ بھری صدا سنائی دیتی ہے۔ان چھیدوں سے وہ ساز پھوٹتا ہے جو ہزاروں لوگوں کے دل جیت لیتا ہے۔[18]

اپنی دیگر نظموں میں رومیؒ بانس کی اس خواہش کے سوز و گداز اور لذت پر بات کرتے ہیں:

''اے میٹھے نغمے پیدا کرنے والی بانس کی آواز۔۔تمہارے سُروں میں شہد کی حلاوت ہے۔تمہارے سُر میرے رات دن کو وفاداری کی خوشبو سے معطر رکھتے ہیں۔ایک بار پھر وہ نغمہ چھیڑ دے۔ایک بار پھر ان ہواؤں سے کھیل۔اے شاہِ خاور۔۔سب سے اجلے۔۔سب سے پیارے! اپنے تمام پیاروں پر اپنی رفعتوں کی تجلّی ڈال دے۔

خاموش رہ۔۔پردہ مت اٹھا! خاموشی کے جام خالی کر دے۔پردہ نشین ہو جا۔خدا کی نرم وگرم پناہوں میں آجا''۔[19]

مندرجہ بالا اقتباس دو اہم پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے:

- خاموشی۔۔خاموشی کا جام جو ہم نے پینا ہے اور اس کی مدد سے خدائی اسرار کا پردہ چاک کرنا ہے۔
- خدائی رحم دلی۔۔وہ پردے میں مستور نہیں ہے۔۔وہ ہم انسانوں کی خامیوں کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔وہ ہماری کمزوریوں کو نہیں دیکھنا چاہتا۔

Marfat.com

مندرجہ بالا اقتباس بھی دل کی خاموشی کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے:

''اگر تم ایمان سے تحفظ طلب کرتے ہو۔۔تنہائی کی تحویل میں آجاؤ!
تنہائی کہاں ہے؟
دل کا گھر!
اپنے دل کے مکین ہو جاؤ!
اس گھر میں ایسی شراب کا پیالا ہے جس سے تمہاری بے خودی دوام پائے گی!
خاموش رہو اور خاموشی کے فن میں کمال پانے کے لئے مسلسل ریاضت کرو!
کبریائی کے خبط سے نکلو۔۔دل ایمان کا گھر ہے!
اپنے دل میں وفاداری کا دامن مضبوطی سے تھام لو!''[20]

لیکن ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنا ہے۔۔یہ راستہ رفعتوں کا راستہ ہے۔۔اور ہمیں آسمانوں کو چھونا ہے۔

''میں نے کہا۔۔
سیڑھی دکھاؤ تا کہ میں آسمان تک جاسکوں!
اُس نے کہا۔۔
تمہارا سر سیڑھی ہے۔۔اپنا سر اتار کر اسے اپنے پاؤں کے نیچے رکھ!
جب تم اپنے پاؤں اپنے سر پر رکھو گے۔۔۔
تمہارے پاؤں ستاروں کے سر پر ہونگے۔
جب تم ہوا سے اوپر اٹھو گے۔۔
ہوا پر قدم رکھو۔۔اور آؤ! آسمانوں کے کئی ہوائی راستے تمہارے لئے کھل جائیں گے۔
تم ہر صبح آسمان تک ایسے پہنچو گے جیسے دُعا۔۔''[21]

ہمیں اپنا سر جھکانا ہے۔۔قوتِ فکر۔۔منطقی عقل کی قربانی دینی ہے۔ یہی سجدہ ہمیں اوپر اٹھا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے دل کی گرہ کھولنی ہے۔ اُس کے بعد ہی ہم ایک ہو سکیں گے۔

''غور سے سنو!
میں ہی دروازہ ہوں۔۔
دروازہ کھولو!

دروازہ بند رکھنا دائمی لطف سے منہ موڑنا ہے۔

ہر جوہر کے دل میں تمہارے قیام کے لئے جگہ موجود ہے۔۔ جب تک تم اِسے کھول نہیں دیتے۔ یہ چھپا رہے گا۔

تم ہی صبح کا سینہ کھولنے والے ہو! تم ہی صادق سویروں کے بادشاہ ہو!
تم سینکڑوں دروازے کھول کر کہتے ہو۔۔:
''اندر آ جاؤ! دروازے پر میں نہیں تم موجود ہو! تمہیں اجازت ہے۔۔ تم
خود ہی دروازہ کھول لو!''[22]

مولانا جلال الدین رومیؒ کے یہ چند اقتباسات ہمارے لئے قدیم تصوف کی دنیا کے چند دریچے وا کرتے ہیں۔۔ اور ہم عشقِ الٰہی کی تپش محسوس کرتے ہیں۔

حافظ شیرازی دوسرے عظیم صوفی شاعر ہیں جنہیں فارسی غزل کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ غزل مغربی صنف سانیٹ کے قریب تر ہے جو عموماً چودہ مصرعوں یا پانچ رکنی بحر پر مشتمل ہوتی ہے۔ حافظ اپنی غزلوں میں محبت کے گیت گاتا ہے اور محبت کی پیدا کردہ مستی، بے انائیت اور بے وقتگی کے اظہار کے لئے شراب کے بلیغ استعارے سے کام لیتا ہے۔۔۔ محبت اور شراب کی مستی اسے محدود انا سے نکال کر بحرِ آسا شعور سے ہم کنار کرتی ہے۔ حافظ کے الہامی گیتوں میں محبت کی مستی کی رفعتیں بے نقاب ہوتی ہیں۔ آیئے حافظ کی دنیا میں قدم رکھیں اور اس کے لطف و انبساط کی غایت کا ادراک پانے کی کوشش کریں۔

''نہیں! میں اُن ہاتھوں کی قسم کھاتا ہوں جو مجھے شراب دیتے ہیں
اب کوئی چھلکتا ہوا جام میرے لبوں کا بوسہ نہیں لے گا!
جب تک میرے ساقی کی روشن جبیں میری محفل نہیں سجاتی۔
جب تک محبت کے راز اُس کے ہونٹوں سے چھن چھن گرنے نہیں لگتے۔۔
جیسے شمع کے شعلوں کی زبانیں۔۔ میں وہ پروانہ ہوں جسے عشق کی آگ میں جلنا ہے۔۔
جب تک میں جل نہ جاؤں۔۔ مٹ نہ جاؤں۔۔ محبت کی آگ کی حدت کو نہیں سمجھ
سکتا''۔[23]

محبت کی حدت عاشق کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتی ہے کہ اُس کے خام شعور کی کثافتیں اس آگ میں بھسم ہو جائیں۔ حافظ اپنے آپ کو پروانہ کہتے ہیں جو شعلے کی محبت میں جل

Marfat.com

جاتا ہے۔۔آگ اور پروانے کی محبت کی گونج کلاسیکی صوفی شاعری میں بار بار سنائی دیتی ہے۔ پروانے اور آگ کی محبت دنیوی سود وزیاں سے عظیم و بُلند ہے۔۔یہ دنیوی نہیں سماوی محبت کا درس ہے جو ہر جلنے والا پروانہ ہمیں دیتا ہے۔

"دنیا کے بازار میں پڑے سونے پر نگاہ ڈالو!
اُن اشک بار آنکھوں کو دیکھو جو بے سود رو رہی ہیں!
کیا اِس سے تمہارے خواہشات سے بھرے دل کی تسکین نہیں ہوتی؟
میں نے بہت کھویا۔۔بہت پایا
میں نے محبت پالی۔۔۔مجھے اور کیا چاہیے؟
میں نے اُسے پالیا ہے جس کے مرہمی ہونٹ میرے ہونٹوں پر ہیں۔۔
میرے لئے یہی کافی ہے"۔[24]

سب سے اہم یہی ہے کہ ہم محدود شعور سے بے کراں الوہی شعور میں داخل ہو جائیں۔

"نفس حافظ نفس! اسی پر تم نے قابو پانا ہے۔
سرائے کے مالک کی بیٹی کی حکمت پر کان دھرو!
آب وگل میں گندھی ننھی منی مخلوق
ایک پرندے کی مانند آرائشِ جمال میں محو۔
حافظ! زندگی ایک کڑی پہیلی ہے۔۔اس پر غور وخوض ترک کر دو!
اِس سوال کا ایک ہی جواب ہے۔۔۔جام!"[25]

صوفیانہ دانش کا ایک اور اہم باب شیخ سعدیؒ وا کرتے ہیں۔ ان کی سادہ مگر پُر کار حکایات اہم روحانی معروفات کو سامنے لاتی ہیں۔ شیخ سعدیؒ روزمرہ واقعات سے گہری دانش کشید کرتے ہیں اور ان کی حکایات کا بنیادی مقصد انسانی شخصیت کی اخلاقی و روحانی نشوونما ہے۔ وہ دل کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتے ہیں جو کھل کر انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا ہے اور ہر طرف اپنی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔ گلستان اور بوستان شیخ سعدیؒ کی روحانی دانش کی نہ صرف بھرپور نمائندگی کرتے ہیں بلکہ الوہی دانش کو مزاجِ عوام کرنے کا فریضہ بھی صدیوں سے بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ اِن کی خوشبو سے آج بھی روشن اور مصفا دل مہک رہے ہیں۔ شکر، صبر، خدا پر بھروسہ اور مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا فن کوئی سیکھنا چاہے تو سعدیؒ سے سیکھے۔

Marfat.com

شیخ سعدیؒ گلستان اور بوستان میں نہ صرف عوام الناس کی روحانی و اخلاقی تربیت کرتے بلکہ شاہ اور شاہی ہرکاروں کو بھی نصیحت فرماتے ہیں:

''اے عصرِ حاضر کے بادشاہ! خدا کے حضور حاضر ہوتے وقت شاہی لباس کو ایک طرف رکھ دے۔۔ وہ ہمیشہ کا بادشاہ اور تو آج ہے کل نہیں ہوگا۔ اُس کے دربار میں حاضر ہونے کا سلیقہ سیکھ لے۔ اُس کے حضور درویش کے روپ میں جا اور فریاد کر۔۔۔

'اے خدا۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ میں بادشاہ نہیں بلکہ تمہارے دربار میں ایک ادنیٰ سا بھکاری ہوں۔ جب تک تمہاری مدد شاملِ حال نہ ہو۔ جب تک تو میرا سہارا نہ بنے۔ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں؟ اے خدا میری مدد فرما۔ اور مجھے نیکی کا راستہ دکھا! میں تمہاری مدد کے بغیر تمہاری مخلوق کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟'

اگر تم دن کو حکومت کرتے ہو۔۔ رات کے وقت اُس سے مدد مانگو! تمہارے سچے خادم ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔۔ کیا تم ہر وقت اپنا سر اپنے بادشاہ (خداوندِ قدوس) کی دہلیز پر نہیں رکھ سکتے''۔[26]

یہ ہر اُس شخص کے لئے معیاری لائحہ عمل ہے جو احساسِ ذمہ داری رکھتا ہے۔ جو جانتا ہے کہ طاقت دراصل ذمہ داری اور جسے ہم طاقت قرار دیتے ہیں وہ دراصل خدمت کی ذمہ داری ہی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کچھ اسی قسم کی کہانی سناتے ہیں تاکہ دلوں کی بند گرہ کھولی جا سکے۔ جس حد تک انسان کا دل کشادہ ہوتا ہے اس قدر اُس کے سامنے قدرت کے راز کھلنے لگتے ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف کشادہ دل ہی خدائی کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔۔ ایک زندہ دل ہی خدا کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ ایک ایرانی کہانی میں ایک بادشاہ کے توسط سے یہی کچھ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اِس بادشاہ سے اس کے وزیرِ اعظم نے کہا:

''جہاں پناہ۔۔ سارا دن آپ امورِ سلطنت میں گم رہتے ہیں اور رات کے وقت یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

Marfat.com

بادشاہ نے جواب دیا:

''رات کے وقت میری نظر خدا پر ہوتی ہے۔ تاکہ دن کے وقت اُس کی نظر مجھ پر رہے''۔ 27

بوستان میں شیخ سعدیؒ کی ایک اور حکایت میں حضرت ذوالنون مصریؒ کا ذکر ہے جن کے، جن کے سر عہدِ عتیق کے مصری صوفیانہ رجحانات اور اسلامی تصوف کو ہم آہنگ کرنے کا سہرا ہے۔ اس حکایت میں وہ خوفِ خدا اور خدائی رحمتوں پر انحصار کو اِس قدر حقیقی بنانے پر زور دے رہے ہیں جیسے دنیوی بادشاہ کا خوف اور انعامات کا بھروسہ حقیقی ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک وزیر ذوالنون مصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا:

''میں دن رات سلطان کی خدمت کرتا ہوں اور مجھے دن رات سزا اور جزا کا خوف ستاتا رہتا ہے''۔

یہ سن کر ذوالنون مصریؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے فرمایا:

''کاش میں بھی اپنے بادشاہ سے اتنا ہی خوفزدہ ہوتا جتنے تم اپنے سلطان سے ہو! اگر میں اُس سے اتنا خوفزدہ ہوتا تو آج میں بھی اُس کے پسندیدہ لوگوں میں سے ایک ہوتا''۔

اگر وزیر کو جزا کا شوق اور سزا کا خوف نہ ہوتا۔ تو آسمان اُس کے پاؤں چومتا۔ اور اگر وزیر خدا سے اتنا ڈرتا جتنا وہ اپنے سلطان سے ڈر رہا تھا۔ وہ خود شہنشاہ ہوتا۔ 28

ہم ایک دوسری کہانی میں ایک اور وزیر سے ملتے ہیں جسے درویشوں کی صحبت میسر آئی اور وہ دنیوی مرتبوں اور درجات سے ماورا ہو گیا ہے۔

''ایک وزیر، جسے معزول کر دیا گیا تھا، صوفی فقیروں کے تکیہ پر جا پہنچا۔ کچھ دن درویشوں کی محفل میں گذارنے کا یہ اثر ہوا کہ اُسے قناعت کا خزانہ مل گیا۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ نے معزول وزیر کو پیغام بھیجا کہ وہ اُسے ایک بار پھر وزارت کی کرسی پر براجمان دیکھنا چاہتا ہے تو وزیر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا فقیری شاہی غلامی سے بہتر ہے''۔ 29

Marfat.com

4۔ ہندوستان میں صوفیا کی آمد:

تیرھویں صدی میں تصوف ایران اور مشرقِ وسطیٰ پہنچ چکا تھا اور یہاں سے مختلف سلاسل سے وابستہ صوفیائے کرام نے ہندوستان کا رخ کیا۔ مسلمان سلاطین اس وقت تک شمالی ہندوستان کے کئی علاقے فتح کر چکے تھے جنہوں نے صوفیائے کرام کا خیر مقدم کیا۔ تاہم اِن صوفیائے کرام نے تختِ شاہی کو کبھی بھی اپنی روحانی سرگرمیوں میں مُخل نہیں ہونے دیا۔ خلوصِ دل اور نیک اعمال سے انہوں نے ہزاروں لوگوں کے دل جیت لئے اور اس طرح اسلامی تصوف پر ہندوستان کی روحانی مہمان نوازی کا خوب رنگ چڑھا۔[30]

ہندوستان نے، طویل روحانی تاریخ کا حامل خطہ ہونے کی وجہ سے، اس نئے عقیدے کے لئے باہیں کھول دیں۔ ہندوستان میں داخل ہونے والے اوّلین صوفیائے کرام کا تعلق سلسلہ سہروردیہ سے تھا[31]۔ اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے کئی روحانی اساتذہ اُس وقت کے بادشاہوں کے روحانی رہنما بنے اس طرح حیدر آباد کا نظام سلسلہ سہروردیہ کا روحانی جانشین تھا۔ اِس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا روحانی سلسلہ حضرت معین الدین چشتیؒ کا قائم کردہ سلسلہ چشتیہ ہے اور یہ روحانی سلسلہ ہندوستان میں 1192 سے قائم ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کا تعلق بھی سلسلۂ چشتیہ سے ہے اور اُن کے مرشد محمد ابو ہاشم مدنی ہیں۔

سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ معین الدینؒ خراسان کے شہر چشت کے رہنے والے تھے اس لئے چشتی کہلائے۔ اور اُن کا رائج کردہ طریقہ تصوف بھی اسی نسبت سے چشتی سلسلے کے نام سے مشہور ہوا۔ تصوف کے دیگر سلاسل کی طرح چشتی سلسلے کا شجرہ طریقت بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔

حضرت معین الدین چشتیؒ نے بخارا اور ثمر قند میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کے مرشد کا نام حضرت عثمان ہارونیؒ ہے جن کے ساتھ انہوں نے مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا۔ ایک روایت کے مطابق مدینہ میں انہوں نے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور انہوں نے انہیں فوراً اجمیر جانے کا حکم دیا۔ خواجہ معین الدینؒ اُس وقت اجمیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اگلی شب دوسرے خواب میں انہیں شمالی ہندوستان کا نقشہ دکھایا گیا جس میں اُس مقام کی نشاندہی کی گئی جہاں خواجہ صاحب نے قیام کرنا تھا۔ اگلے ہی روز وہ ہندوستان کے سفر پر روانہ

ہوئے۔۔سب سے پہلے دہلی پہنچے جہاں ہندو راجہ پرتھوی راج حکومت کرتا تھا۔دہلی کے گورنر نے انہیں شہر سے نکالنا چاہا مگر:

''جو کوئی بھی شاہی حکم نامہ لے کر خواجہ صاحب کے پاس جاتا اُن کی مقناطیسی شخصیت اور روحانی جمال وجلال کی تاب نہ لا کر ان کا خدمت گذار بن جاتا اور اسلام قبول کر لیتا''۔[32]

اس طرح خواجہ معین الدین چشتیؒ کے امن اور محبت کے پیغام نے ہندوستانیوں کے دل جیت لیئے۔ہندوستان میں اسلامی تصوف کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ مساوات، اخوت اور محبت کی عملی تعلیمات تھیں اور یہی وہ سب کچھ تھا جس کی ہندوستان کے پسے اور بکھرے ہوئے طبقات کو ضرورت تھی۔

پہلے پہل اجمیر میں سلسلہ چشتیہ کو بھاری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم ہر بار خواجہ صاحب معجزانہ طور پر دشمنوں کی سازشوں سے بچ گئے اور ان کے چاہنے والوں میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا۔اِس دوران انہوں نے اپنے روحانی جانشین حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے درمیان، جو اُس وقت دہلی میں تھے، خطوط کا تبادلہ ہوا۔ان میں سے ایک خط میں قطب الدین بختیار کاکیؒ نے پوچھا:

''انسان کیسے جان سکتا ہے کہ اُسے خدا کا قرب میسر آ گیا ہے اور وہ خدا کے قریب ہے؟''۔

حضرت معین الدین چشتیؒ نے جواب میں لکھا:

''یہ جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اچھے اعمال بجالاتا رہے اور یہ اچھی طرح جان لے کہ اُس کے لئے خدا کے قرب کے دروازے اُس وقت تک کھلے ہیں جب تک اُس میں اچھے اعمال کی سکت باقی ہے''۔[33]

یہی بات وہ ہمیشہ کہتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں ''غریب نواز'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔حضرت کا ایک اور قول صوفیانہ فلسفہ وعمل کا مغز قرار دیا جاسکتا ہے:

''علم ایک سمندر ہے اور روشن نظری اس سمندر کی ایک لہر۔۔بندے اور خدا کا کیا تعلق ہے؟ علم کے سمندر کو خدا نے تھام رکھا ہے اور روشن نظری کو انسان نے قائم رکھنا ہے''۔[34]

حضرت معین الدین چشتیؒ کا وصال 1236 میں ہوا جب اُن کی عمر 93 برس۔ ان کی درگاہ اجمیر شریف میں ہے جہاں انڈیا اور پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک سے لاکھوں لوگ ہر سال اُن کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ جو کوئی بھی یہاں زیارت کی غرض سے آتا ہے یہاں کا فیضان انگیز ماحول اُس کے دل کو چھو لیتا ہے۔ درگاہ کے احاطے میں ایک قدِ آدم دیگ موجود ہے جس میں ہر وقت غریبوں کے لئے کھانا تیار ہوتا رہتا ہے۔ اِس سے ایک بار پھر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت بھی تصوف کا لازمی جزو رہا ہے۔

سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات اور مراقبے کے ساتھ موسیقی بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دورانِ سماع اکثر وجد میں آجایا کرتے تھے۔ اُن کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی محافلِ موسیقی میں وجد آور روحانی موسیقی (قوالی) کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔[35]

یہ مترنم روایت صدیوں سے سلسلہ چشتیہ میں صدیوں سے جاری ہے اور موجودہ وقت تک کئی روحانی اساتذہ نے اس فن کی تجدید میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ (1238-1325) بھی حضرت معین الدین چشتیؒ کے روحانی جانشینوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کا مزار دہلی سے باہر تھا تاہم آج کل یہ جگہ نئی دہلی کہلاتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی ملحقہ مسجد کے ساتھ حضرت امیر خسرو کا مزار ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عظیم صوفی شاعر اور موسیقار تھے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر آنے والے لاکھوں لوگ حضرت امیر خسرو کے مزار پر بھی ہر سال حاضری دیتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتامی عشرے میں حضرت عنایت خانؒ کے نانا جان، مولا بخش خان جو ایک عظیم موسیقار تھے، بارودہ کی میوزک اکیڈمی گیان شالا کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ مولا بخش خان نے اصطفائی طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے گذشتہ اور موجود موسیقاروں کے محاسن کو یکجا کرتے ہوئے نئے آہنگ اور ترنم عطا کئے۔ حضرت عنایت خانؒ نے اپنے خاندان کی اسی روایت کو زندہ رکھا۔ اِس کے علاوہ حضرت عنایت خانؒ نے تصوف کو عالمگیر روحانی ضابطہ اخلاق و عمل میں ڈھال دیا۔ اور مغرب کے اندھیروں میں تصوف کی شمع روشن کی۔ اس طرح تصوف کا سفر آج بھی جاری ہے۔

باب 2

حضرت عنایت خانؒ

1۔ عہدِ طفولیت:

حضرت عنایت خانؒ 5 جولائی 1882 کو ہندوستان کی ریاست بارودہ میں پیدا ہوئے۔ بارودہ ایک روشن نظر اور ترقی پسند ریاست تھی۔ ریاست کے راجہ سیاجی ہندوستانی معاشرے کو ایک ترقی پسند سماج کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا:

> ''ہندوستان زرعی دور میں نہیں جم جانا چاہیے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ہندوستانی معاشرے کو صنعتی اور کمرشل معاشرہ بنائیں۔ میرے نزدیک اس سے اہم مشن ہمارے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم مغرب کو فلسفہ پڑھائیں اور اُن سے جدید علوم سیکھیں۔ مغرب کو پاکیزہ زندگی گذارنے کا ڈھنگ سکھائیں اور اُن سے سیاسی علوم سیکھیں۔ امریکہ کو روحانی علوم کا تحفہ دیں اور اُن سے کاروبار اور تجارت سیکھیں''۔

مغرب اور مشرق کے محاسن کو یکجا کرنا بعد ازاں حضرت عنایت خانؒ کا روحانی مشن بن گیا اور حضرت عنایت خانؒ نے مغرب میں عالمگیر تصوف کی تحریک کی بنیاد رکھی۔ حضرت عنایت خانؒ کے نانا جان نے اُن کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ مولا بخش کا نام سلسلۂ چشتیہ کے ایک درویش نے رکھا۔ درویش نے بشارت دی:

> ''مولا بخش تمہارا نام ہوگا اور تمہاری موسیقی ہندوستان اور دنیا بھر میں گونجے گی''۔ سوانح عمری 19

درویش کی دعا کے چند برس بعد مولا بخش کو ہندوستان کے عظیم گلوکار غاسط خان نے اپنے اکلوتے شاگرد کے طور پر قبول کرلیا۔ انہوں نے موسیقی کے جملہ اسرار و رموز غاسط خان سے سیکھے اور اپنے استاد کے انتقال تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اِس کے بعد انہوں نے ہندوستان کا سفر شروع کیا۔۔ بے شمار راجوں کے دربار میں فن کا مظاہرہ کیا اور داد پائی۔

مولا بخش خان پر عرب اور ایرانی موسیقی کی گہری چھاپ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں شمال کی سادہ اور مقدس موسیقی پر بھی کمال حاصل تھا۔ کچھ عرصے کی ریاضت کے بعد اُن کی موسیقی شمالی ہندوستان کی سادگی اور جنوبی ہندوستان کی گہرائی سے مزین ہو چکی تھی۔ بعد ازاں انہوں نے جنوب اور شمال کی موسیقی کو ہم آہنگ کرنے کو اپنا مقصد بنالیا تا کہ ہندوستان بھر میں اُن کی موسیقی کو اپنائیت اور قبولیت میسر ہو۔[1]

ہندوستانی موسیقی کے علاوہ انہوں نے مغربی موسیقی کا گہرا مطالعہ اور ریاضت کی اور وائسرائے کے لئے خصوصی سازینہ تیار کیا۔ جب وہ کئی سال بعد بارودہ پہنچے تو ترقی پسند مہاراجہ نے موسیقی کی درسگاہ گیان شالا کی بنیاد رکھی اور مولا بخش کو اِس کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد مولا بخش نے اپنی زندگی ہندوستانی موسیقی کی تدریس اور ترقی کے لئے وقف کر دی۔ مولا بخش کی زیرِ نگرانی اس اکیڈمی کے دروازے ہر رنگ، نسل، مذہب اور جنس کے لئے کھلے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موسیقی کی تعلیم ہر ایک کے لئے ضروری قرار دینی چاہیے کیونکہ انسانی کردار پر موسیقی نہایت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔

مولا بخش کے گھر میں ہندوستان بھر کے موسیقاروں، کلا کاروں اور فلسفیوں کی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ ان مجالس میں دنیوی اور روحانی موضوعات پر بات چیت ہوتی اور خاص طور پر دنیا بھر کے انسانوں کو وحدت کا قالب عطا کرنے پر غور و خوض ہوتا۔ یہی وہ دور تھا جب نوجوان عنایت خانؒ کے دل میں فرقوں، مذہبی فرودگاہوں اور رنگ و نسل میں منقسم نسلِ انسانی کو وحدت کے شیرازے میں باندھنے کا خواب جاگا۔

> ''یہ بالکل ایسے تھا جیسے اُن میں اپنے نانا کی روح حلول کر گئی ہو۔ مولا بخش نے حضرت عنایت خانؒ کو یہ سمجھا دیا کہ زندگی صرف انہی کے لئے جو کسی نصب العین میں حقیقت کا رنگ بھرنا جانتے ہیں''۔ سوانح عمری 29

بچپن میں اُن کے نانا جان حضرت عنایت خانؒ کو صبح سویرے جگایا کرتے تھے اور وہ عبادات کے بعد دیر تک ریاض میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

اُن کی ریاضتوں میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ حضرت عنایت خانؒ نے مولا بخش کی شخصیت کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ انہوں نے وہ سب کچھ اپنالیا جو مولا بخش کی شخصیت کا خاصہ تھا''۔ سوانح عمری 29

حضرت عنایت خانؒ کے والد رحمت خان تعلق بھی موسیقار، شاعر اور صوفی گھرانے سے تھا۔ ہندوستان میں انہوں نے اپنے مرشد سے پوچھا کہ انہیں کہاں جانا چاہیے۔ مرشد نے بارودہ کی طرف اشارہ کیا اور رحمت خان بارودہ چلے آئے۔ بارودہ میں ان کی ملاقات مولا بخش سے ہوئی اور رحمت خان نے اُن کے دل میں گھر کرلیا۔ بعدازاں انہوں نے مولا بخش کی بیٹی سے شادی کرلی اور گیان شالا میں اپنے پدرِ نسبتی کی ہر طرح سے مدد کی۔ رحمت خان ایک بہت بڑے کلاسیکی گلوکار تھے۔

حضرت عنایت خانؒ کے والد سخت مزاج ہونے کے باوجود نہایت رحم دل اور پیار کرنے والے انسان تھے۔ سوانح عمری کے مطابق:

''رحمدلانہ اعمال اور شائستہ دلی وہ اصول تھے جن پر انہوں نے ہر حال میں عمل کیا۔ اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا''۔ سوانح عمری 31

حضرت عنایت خان کی والدہ کا نام خدیجہ بی بی تھا۔ حضرت عنایت خانؒ کی سوانح عمری اُن کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی۔ اُن کی شخصیت کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے کہ وہ نیک دل، عبادت گذار اور پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ انہیں عربی اور فارسی ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور ان دو زبانوں کے علاوہ وہ اردو زبان و ادب کا لاثانی مذاق اور مہارت رکھتی تھیں۔ وہ اپنے گھر میں کام کرنے والوں کے ساتھ بالکل اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ کی جائیداد سے اپنا حصہ لینے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ:

''جو کچھ میری اولاد کو میرے والد صاحب نے دیا میرے لئے وہ کافی ہے۔ اگر میرے بچوں کو وراثت میں اُن کی شخصیت ہی مل جائے تو میرے لئے بہت ہے۔ جائیداد کب تک باقی رہے گی؟ لیکن ابا حضور کی تربیت کا اثر ہمیشہ باقی رہے گا''۔ سوانح عمری 33

حضرت عنایت خانؒ کی ولادت سے قبل اُن کی والدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھتیں اور وہ ان کی تکالیف کا ازالہ کرنے کے بعد چلے جاتے۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو پیغمبروں اور اولیائے کرام کے درمیان پاتیں اور یہ سب برگزیدہ ہستیاں انتہائی شفقت سے خدیجہ بی بی کو خوش آمدید کہتیں۔ وہ سب آنے والے اُس دور کے بارے میں بات کرتے جب انسان فروعی مسائل سے ماورا ہو کر یہ جان لے گا کہ سب ایک ہے۔

خدیجہ بی بی فطرتاً شرمیلی، خوش خو اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ انہوں نے اپنے خوابوں کے بارے میں بی ماں (نانی جان) کے علاوہ کسی کو کچھ نہ بتایا۔ بی ماں نے جواب دیا:

''یہ نہ صرف خوشخبری ہے بلکہ ایک ماں ہونے کے ناطے بہت بھاری ذمہ داری بھی ہے۔ اِس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤ اور خدا سے دُعا کرو کہ وہ تمہیں یہ عظیم ترین ذمہ داری نبھانے کی ہمت اور حوصلہ دے۔ تم اُن ہستیوں سے مدد مانگو جنہیں تم خواب میں دیکھتی ہو''۔ سوانح عمری 33

روحانی، اخلاقی اور تخلیقی قدروں کے حامل اِس خاندان میں حضرت عنایت خانؒ نے آنکھ کھولی اور بہت جلد اپنی غیر معمولی ذہانت اور اعلیٰ اوصاف سے اپنے اردگرد موجود ہر شخص کا دل جیت لیا۔ اُن کے رجحانات، سوچ، معیارات اور تجربات سب مل کر انہیں ایک عظیم مقصد کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اُن کی سوانح عمری ہندوستان میں ان کے لڑکپن کی بہت خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ موسیقاروں، شاعروں، صوفیائے کرام اور شہزادوں سے اُن کی ملاقاتوں کے پس منظر میں ہندوستان کسی طور پر بھی الف لیلوی پرستان سے کم نظر نہیں آتا۔ ان کے لڑکپن کی بہت سی کہانیوں سے اُن کی روحانی اور صوفیانہ بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہم یہاں ان کے بچپن کے چند واقعات پر اکتفا کریں گے:

''وہ بچپن میں ہی اپنے کیک اور ٹافیاں بھائیوں اور دوستوں میں بانٹ کر خوش ہوتے تھے''۔ سوانح عمری 37

''وہ دوسرے کے دکھ اور تکالیف کو محسوس کرتے اور اکثر اوقات خاموش بیٹھ جاتے۔ بچپن میں ہی اُن کے صوفیانہ رجحانات کچھ اس طرح سامنے آنے لگے کہ وہ دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان بیٹھے بیٹھے کھو جاتے اور گردوپیش سے ماورا ہو جاتے''۔ سوانح عمری 41

زندگی کے تکاملی ایام کے دوران ہی اُن کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جن کا تعلق کسی دوسرے مذہب سے تھا۔ ان ملاقاتوں میں انہوں نے مذاہب کے ان پہلوؤں پر غور کرنا شروع کر دیا جو سب مذاہب میں مشترک اور بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ مذہب کسی ایک ہی سچائی کا نام ہے جو مختلف ادوار اور معاشروں میں بسنے والوں کو ایسے اخلاقی اور روحانی ضابطوں سے روشناس کراتا ہے جو قائم و ثابت ہیں۔

اگرچہ اُن کا تعلق مسلمان گھرانے سے تھا ابتدائی تعلیم کے لئے انہیں ایک ہندو سکول (میراٹھی) میں بھیجا گیا جسے اُس دور کا جدید ترین سکول مانا جاتا تھا لیکن تعلیم روایتی انداز میں دی

Marfat.com

جاتی تھی[3]۔ جب اُن کے والد اور نانا جان نے یہ جان لیا کہ نوجوان عنایت خانؒ روحانیت کی طرف مائل ہے تو اُن کی ملاقات اُس دور کے عظیم صُوفیا اور یوگیوں سے کرائی گئی۔ اس دوران اُن کی ملاقات اُس دور کے مشہور سوامی ہمساوروپا سے کرائی گئی اور حضرت عنایت خانؒ کو ہندومت میں گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اسی دور میں انہوں نے بھگود گیتا کا مطالعہ کیا اور ہندوسکالرز کی میراٹھی زبان میں دسترس حاصل کر لی۔ ہندومت میں دل چسپی کے باوجود وہ تمام زندگی صوم وصلوۃ کے پابند اور عشقِ رسول اللہ کا دم بھرتے رہے۔ سوانح عمری 53

بعدازاں حیدرآباد میں اُن کی ملاقات پارسیوں سے ہوئی اور اُن کے توسط سے انہیں دنیا کے اس قدیم ترین مذہب، جس کی بنیاد زرتشت نے رکھی تھی، کے صفِ اول کے علما سے ہوئی۔ پارسی علما یہ دیکھ کر حیران ہوگئے کہ حضرت عنایت خانؒ نے ان کے مقدس بھجن اتنی عقیدت سے کمپوز کیے تھے جیسے انہوں نے خود انہیں موسیقی سے مزین کیا ہو۔ سوانح عمری 77,78

حضرت عنایت خانؒ کو بچپن سے ہی مغربی معاشرت اور زندگی میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ مغرب کے بارے میں جاننا پسند کرتے تھے اسی لئے انہوں نے جلد ہی انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرلی۔ اس نئی زبان کو سیکھنے کے بعد وہ کسی بھی اہلِ زبان کے ساتھ اس زبان کی مشق میں لطف محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے چچا علاؤالدین خان (ڈاکٹر اے۔ ایم پٹھان) سے یورپین موسیقی کی تعلیم حاصل کی جو لنڈن کی رائل اکیڈمی آف میوزک سے موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے۔ اس سب کے ذریعے وہ اپنے آپ کو مغرب میں عظیم ترین روحانی مشن کے لئے تیار کر رہے تھے۔

حضرت عنایت خانؒ کے والد نے انہیں بہت کچھ سکھایا۔ جونہی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت عنایت خانؒ درون بین نوجوان اور گوشہ نشینی کی طرف مائل ہیں تو انہوں نے انہیں دنیوی زندگی کی اہمیت کا احساس دلایا۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے سوانح عمری 55۔ انہوں نے حضرت عنایت خانؒ کو ساتھی انسانوں کی محبت اور خدمت کی عظمت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے انہیں سچ بولنے اور پاک زندگی گذارنے کی تلقین کی۔ ان کی یہ تعلیمات حضرت عنایت خانؒ کے دل میں اتر گئیں اور ان کی حقیقی شخصیت منظرِ عام پر آئی۔ سوانح عمری 56

1896 میں، حضرت عنایت خانؒ کی چودھویں سالگرہ کے کچھ روز بعد، مولا بخش کا انتقال ہوگیا اور حضرت عنایت خانؒ ایک شفیق استاد، مہربان دوست اور رول ماڈل سے محروم ہوگئے۔ ان کی موت کا صدمہ حضرت عنایت خانؒ کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ تاہم نانا جان کی جدائی نے بھی ان کے علم میں اضافہ کیا۔ جدائی کے اس صدمے کے بعد وہ حیات وممات کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ سوانح عمری 58

Marfat.com

2۔ ہندوستان کا سفر:

حضرت عنایت خانؒ کے والدین نے سوچا کہ ماحول کی تبدیلی ہی انہیں نانا جان کی موت کے صدمے پر قابو پانے کے قابل بنا سکتی ہے۔ اس دوران اُن کے والد کو نیپال کے راجہ کی طرف سے ایک محفلِ موسیقی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جس میں ہندوستان بھر کے عظیم موسیقار شرکت کر رہے تھے۔

یہ ہندوستان میں حضرت عنایت خانؒ کا پہلا سفر تھا۔ اس سفر کے چودہ سال بعد وہ پورے ہندوستان سے واقف ہو چکے تھے۔ حضرت عنایت خانؒ کی سوانح عمری میں ان کے سفر کا بیان ان کی زندگی کے واقعات کو خوابناک رنگ دیتا ہے۔ کیونکہ سوانح عمری میں ہندوستان کی فطری دنیا کا حسن کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ نیپال کے سفر کے دوران انہیں چھ روز تک ایک جنگل سے گذرنا پڑا۔ بعد ازاں مہاراجہ کے مہمانوں کے لئے پالکیاں بھیجی گئیں لیکن انہوں نے پیدل سفر کرنا پسند کیا۔ اِس سفر کے دوران وہ فطرت کے حسن سے محظوظ ہوئے۔ جنگل کی خاموشی اور پرندوں کی مترنم آوازوں نے ان کے لئے روحانیت کی نئی راہیں روشن کیں۔

جنگل میں کئی سو سال پرانے درخت مراقباتی استغراق میں بے انانیت کا لطف اٹھا رہے تھے۔۔ وہ ایسی جگہوں پر بھی مستی سے جھوم رہے تھے جہاں انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا تھا۔ ان درختوں کا ہر پتہ امن اور سکون کا خدائی پرچم لگتا تھا۔ ''انہوں نے ہر جھکتی شاخ میں خدائی ذوقِ تخلیق کو محوِ رقص دیکھا''۔ سوانح عمری 59

یہ سفر حضرت عنایت خانؒ کے روحانی، فکری اور فنی ارتقاء کے لئے نہایت اہم ثابت ہوئے۔ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں حضرت عنایت خانؒ نے ہندوستان کے عظیم ترین کلاکاروں کو سنا تو انہیں موسیقی کے فن اور علم کو سمجھنے کا موقع ملا۔ یہاں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ موسیقی اُن فنکاروں کی شخصیات میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔۔ اور سب سے اہم یہ کہ انہوں نے یہ راز پالیا کہ موسیقی پاک ہے۔۔ مقدس ہے۔۔

اِسی دوران انہوں نے یہ بھی جان لیا کہ وہ لوگ جو موسیقی میں گہرا نہیں اتر پاتے ہیجان اور برانگیختگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔ ایسے لوگ زندگی کے سطحی پہلوؤں اور اعمال و اشغال میں کھو جاتے ہیں، محبت اور نفرت کے بے لگام جذبات کے غلام ہو کر ہر لمحہ غیر مستحکم جذبات کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ سوانح عمری 61

Marfat.com

حضرت عنایت خانؒ کو بعض موسیقاروں اور گلوکاروں کا یہ رویہ بالکل پسند نہ آیا کہ راجوں مہاراجوں کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے موسیقی سے زیادہ فنِ خوشامد پر ریاضت فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں ہندوستان میں موسیقاروں اور فنکاروں کا یہ رویہ ہندوستانی موسیقی کے زوال کا باعث بن رہا تھا۔ جب وہ 1902 میں بمبئی پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے سنجیدہ میوزک کی جگہ ہلکی پھلکی عامیانہ موسیقی لے رہی ہے اور اس بات پر انہوں نے گہرے دُکھ کا اظہار کیا۔ وہ اس تنزل کی وجہ سے واقف تھے۔

صدیوں سے حقیقی ہندوستانی میوزک شاہی درباروں اور محلات میں راجوں کی خوش گوشی کا سامان بنارہا تھا اور عوام الناس کو ہمیشہ برصغیر کی حقیقی موسیقی سے محروم رکھا گیا تھا۔۔ عام لوگ برصغیر کے اس عظیم ورثے سے بالکل واقف نہیں تھے سوانح عمری 66۔ جب انہوں نے ہندوستان کے عام لوگوں کے لئے موسیقی کا سامان کیا تو اُن کی بے توجہی کی ایک اہم وجہ یہی تھی۔ بعدازاں انہوں نے صرف اپنے لئے گانا شروع کر دیا اور وہ خاصے کامیاب رہے۔

ایک سال بعد حضرت عنایت خانؒ اپنے والد صاحب کے ساتھ بارودہ واپس آگئے۔ اُن کی والدہ محترمہ نے اُن کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اس کے بعد ماں بیٹے کے درمیان گہرا ربط اور باہمی افہام وتفہیم دیکھنے میں آئی۔ اِس لئے حضرت عنایت خانؒ کو اُن کی وفات پر گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر شروع کر دیے۔ میسور میں انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور حیدرآباد میں ان کے فن نے اوجِ کمال کو چھوا۔ حیدرآباد میں چھ ماہ تک وہ ریاضت کرتے رہے اور اس دوران انہوں نے موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی۔ چھ ماہ بعد اُن کے ایک دوست نے ان کا تعارف حیدرآباد کے وزیرِاعظم سے کروایا جو اُن کے فن اور شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں فوراً نظام کے پاس لے گیا۔ حیدرآباد کے نظام نے نہ صرف حضرت عنایت خانؒ کے میوزک کو سراہا بلکہ اُن کے روحانی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ سوانح عمری حضرت عنایت خانؒ کی نظام سے ملاقات کو کچھ بیان کرتی ہے:

> ''نظام کے دربار میں داخل ہوتے ہی یہ محسوس ہو چلا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔ نظام خود ایک موسیقار اور شاعر تھا۔۔ وہ جان گیا کہ وہ آسانی سے عنایت خانؒ کی موسیقی کی دنیا کا باسی ہوسکتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ بھی نظام کی سادگی، کم یاب مذاق اور

Marfat.com

انسان دوستی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نظام بھی یہ بھانپ گیا کہ حضرت عنایت خانؒ کا میوزک محض ایک پردہ ہے جس نے ایک حیران کن راز چھپایا ہوا ہے۔۔ نظام کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے کہ وہ اس رمز کو جان پائیں"۔ (سوانح عمری 70)

جب نظام نے بیتاب ہوکر اُن سے پوچھ لیا تو انہوں نے بتایا:

"صوت ظہور اور رمز کشائی کا بلند ترین وسیلہ ہے۔۔ اسی لئے یہ پر اسرار ہے۔ جو کوئی صوت و ترنم کا علم رکھتا ہے اُس کے لئے اس کائنات کے اہم ترین راز راز نہیں ہیں۔ میری موسیقی میری فکر ہے اور میری فکر میرا جذبہ ہے۔ میں جذبات کے سمندر میں جس قدر گہری ڈبکی لگاتا ہوں۔۔ اتنی ہی خوبصورت دُھنوں کے موتی لے کر سطح پر ابھرتا ہوں۔ میری موسیقی دوسروں کو محظوظ اور مسحور کرنے سے قبل مجھے وجد آور سرور سے آشنا کرتی ہے۔ میری موسیقی میرا دھرم ہے اس لئے دنیوی دولت اس کا مول نہیں چکا سکتی۔ موسیقی میرے لئے تکمیل کا راستہ ہے۔۔ جادۂ تحصیل نہیں"۔ سوانح عمری 70

نظام یہ سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں تان سین ثانی قرار دیا اور قیمتی زمرد کی انگوٹھی حضرت عنایت خانؒ کی انگلی میں سجادی۔ اس سے حضرت عنایت خانؒ ہندوستان بھر میں مشہور ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے ہر جگہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران انہوں نے مقدس مقامات کی زیارت اور صوفیائے کرام سے ملاقات کو اہم ترین روحانی شعار کے طور پر نبھایا۔ کھٹمنڈو میں ان کی ملاقات ایک معمر صوفی سے ہوئی جن کی خوبصورت شخصیت نے اُن کا دل موہ لیا۔ ایک دن جب وہ گھوڑے پر پہاڑی علاقے سے گذر رہے تھے:

"انہوں نے کسی کو ایک ایسے بلند مقام پر بیٹھے ہوئے دیکھا جہاں آج سے قبل کوئی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ بلندی پر بیٹھا ہوا آدمی ایک مہاتما ہے جو کافی عرصے سے مراقبہ فرما رہا ہے۔ جونہی مہاتما کے ساتھ اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔۔ انہیں اپنے اندر گہرے سکون اور الوہی توانائیوں کی کرن اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔۔ جو کیفیت مہاتما نے اُن پر طاری کردی تھی اُس کے اظہار کی راہ میں

الفاظ کی تنگ دامنی حائل تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس جگہ کے تمام درخت، تمام پتے مہاتما کے سامنے قطار اندر قطار دست بستہ کھڑے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شوخ مزاج ہوائیں بھی اس مقام پر ادب سے سدھ بسرائے گذر جاتی تھیں۔ یہ سب اُس ہستی کی روحانی طمانیت کی بدولت ہو رہا تھا۔ حضرت عنایت خانؒ نے مہاتما کے لئے گانا شروع کر دیا اور مہاتما نے اُن پر پیار سے ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد حضرت عنایت خانؒ نے اکثر اس مقام پر جانا شروع کر دیا اور بعض اوقات وہ اپنی وینا بھی ساتھ لے جاتے۔ جو روشنی، جو طاقت، جو سکون مہاتما نے انہیں دیا اُن کی زندگی ہمیشہ کے لئے اُسی کیف اور توانائی کی متلاشی ہو گئی''۔ (سوانح عمری 3-62)

3۔ روحانی تلاش:

حیدرآباد کے نظام کے ہاں قیام کے دوران حضرت عنایت خانؒ نے زیادہ سے زیادہ وقت مراقبے اور غور و فکر کے لئے وقف کر دیا۔ وہ رات کے وقت مراقبے کے لئے بیدار ہوتے اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ایک روشن ہالہ انہیں رفتہ رفتہ گھیرنے لگا ہے۔ بعد میں ایک آواز مسلسل سنائی دینے لگی ''اللہ اکبر''۔ اللہ اکبر''۔ یہ آواز انہیں رات کے کسی پہر جگا دیتی اور وہ یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ایک خوبصورت چہرے کا چاند اُن کی آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا۔ انہوں نے اس سے زیادہ خوبصورت مردانہ چہرہ زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ اگلے دن انہوں نے یہ واقعہ اپنے دوست کو سنایا تو انہوں نے جواب دیا:

> ''اب تم اُس مقام پر پہنچ گئے ہو جہاں مرشد کی ضرورت پڑتی ہے۔ کامل مرشد تلاش کر دیا پھر اللہ سے دعا کرو کہ مرشد کامل تمہیں چن لے''۔ سوانح عمری 73

پس انہوں نے باطنی قائد کی تلاش شروع کر دی۔ پہلے پہل کئی بزرگوں نے ان کی رہنمائی سے انکار کر دیا اور الٹا ان سے التجا کی کہ وہ اُن کی رہنمائی فرمائیں۔ آخر کار وہ حیدرآباد کے عظیم روحانی پیشوا مولانا خیر المبین سے ملے۔ حیدرآباد کا نظام اُن کا خطبہ احترام میں کھڑا ہو کر سنا کرتا تھا۔ حضرت عنایت خانؒ سے ملاقات کے بعد مولانا نے فرمایا:

''میں؟۔۔میں اس قابل نہیں ہوں۔۔میں آپ کا نوکر۔۔آپ کا غلام تو
ہوسکتا ہوں روحانی رہنما نہیں''۔

اس کے بعد سوانح عمری میں لکھا ہے:

''اس کے بعد ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔جیسے کسی نے عملِ اشراق کی
مدد سے انہیں پیغام دیا ہو کہ وہ آرہے ہیں۔۔انہوں نے ایک لڑکے سے کہا:
''کرسی صاف کردو اور دروازہ کھول دو! وہ آرہے ہیں!''

چند لمحے بعد دروازے میں ایک ایسی شخصیت موجود تھیں جن کے نورانی چہرے سے یوں لگتا تھا کہ وہ آسمان سے اترے ہیں۔اس کے باوجود حضرت عنایت خانؒ نے اُن کے چہرے پر مانوس سی شفقت دیکھی۔ بعد میں اُن پر کھلا کہ یہ وہی بزرگ تھے جن کا دیدار انہیں دورانِ استغراق ہوا کرتا تھا۔جب مرشد اُس جگہ بیٹھ گئے جو اُن کے لئے تیار کی گئی تھی تو انہوں نے اپنی نظریں حضرت عنایت خانؒ پر جمادیں۔حضرت عنایت خانؒ کو یوں لگا کہ وہ اُن سے نظریں نہیں ہٹا پائیں گے۔۔ایک نظر سے ہزاروں سال کے فاصلے مٹ گئے:

''کون ہے یہ نوجوان۔۔۔ جو میری روح کو اس خلوص سے کھینچتا رہا
ہے''مرشد نے فرمایا:

مولانا خیر المبین نے جواب دیا:

''حضور آپ کے غلام موسیقی کی دنیا کے نابغہ عنایت خانؒ ہیں اور آپ کی
فیضان انگیز رہنمائی کے طلب گار ہیں''۔

انہوں نے فوراً حضرت عنایت خانؒ کو اپنے پاس بلایا اور اپنی روحانی سرپرستی میں لے لیا۔حضرت عنایت خانؒ نے مرشد کے لئے ایک گیت ترتیب دیا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''تم نے میرا ہاتھ تھاما ہے۔۔اب میرا افتخار تمہارے دستِ امانتدار میں محفوظ ہے۔
میرا دل۔۔میرا اکلوتا خزانہ۔۔میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔
اب میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں اور میں خوش ہوں!
تمہارے دیے ہوئے ایک جام نے مجھ پر مستی طاری کردی ہے۔۔
اب مجھے دیوتاؤں کا مشروب نہیں چاہیے۔
یوسف کی طرح تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔۔
عیسیٰ کی طرح مجھے ایک بار پھر زندہ کردیا ہے۔

Marfat.com

موسیٰ کی طرح مجھے خدا کا پیغام سنایا ہے۔
پیامِ محمدی کا وہ جام پلایا ہے، جس کی مستی نے میری آرزو بدل دی ہے۔
تمہاری عنایت سے عنایت نے وہ سب پالیا ہے، جس کی اُسے خواہش تھی!
میرے کلیم۔۔۔میرے مسیحا۔۔۔میرے آقا۔"

یہ گیت انہوں نے اپنے مرشد کے لئے گایا تو وہ جھوم اٹھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ حضرت عنایت خانؒ کے سر پر رکھا اور اُنہیں دُعا دی:

"نورِ خداوندی تمہاری رہنمائی کرے اور تم اللہ کی مخلوق کے لئے ذریعہ رحمت بنو!" سوانح عمری 76-75

اب حضرت عنایت خانؒ اور مرشد کے درمیان گہرا روحانی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ ایسا رشتہ جو روحانی راستوں پر انسان کی راہوں کو منور کرتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کے مرشد کا تعلق بھی سلسلہ چشتیہ سے تھا اور اُن کا نام محمد ابو ہاشم مدنیؒ تھا۔ حضرت عنایت خانؒ جب بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اپنا دل ایک خالی جام کی مانند کھولے رکھتے۔ اور محمد ابو ہاشم مدنیؒ ان کے دل میں نورانی الفاظ کی بارش فرماتے۔ اُن کے درمیان کئی فیضان خیز ملاقاتیں ہوئیں اور اِس دوران مرشد کی موجودگی کے احساس نے گردوپیش کو مہکائے رکھا۔ ایضاً 76

گھر واپس آکر وہ گھنٹوں خاموش رہتے اور جب وہ مرشد کے ساتھ ہوتے تو وہ محسوس کرتے کہ:

"وہ تمام مسائل۔۔۔تمام سوالات سے بلند ہو گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اُن سے کچھ نہ پوچھتے۔ وہ محسوس کرتے کہ انہیں الفاظ کی حاجت نہیں رہی۔ مرشد کی موجودگی ہی اُن کے لئے کافی تھی۔ وہ سب جو انہیں مشکل، مہین اور لاینحل لگتا تھا نہایت سہل اور سہج لگنے لگتا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے کہ وہ سب جانتے ہوں۔ وہ سب جو مستور تھا مرشد کی موجودگی میں غیر محجوب ہو جاتا"۔ ایضاً 80

اُن کے دوست اُن میں ایک حیران کن تبدیلی دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ بدل سے گئے تھے۔ ان کی گائیکی کا انداز بدل گیا تھا۔ نظام بھی اس بات پر حیران تھا اور اس نے انہیں دربار میں رکھنے کی کوشش کی لیکن حضرت عنایت خانؒ دربار چھوڑنے پر بضد تھے۔ انہیں وہ کچھ مل چکا تھا جو دنیوی درباروں اور شاہی طور اطوار سے عظیم و بلند تھا۔

جب 1908 میں اُن کے مرشد قفسِ عنصری سے آزاد ہوئے تو اُن کے دل میں ایک

Marfat.com

خلاء پیدا ہوگیا۔ دنیا کے عارضی گھر سے جانے سے قبل محمد ابو ہاشم مدنیؒ نے اپنے اردگرد موجود تمام لوگوں سے معافی مانگی، اُن سب کے لئے دُعا کی اور ظاہری آنکھیں بند کرلیں۔ اُن کے انتقال کے بعد نظام کا شاندار دربار حضرت عنایت خانؒ کے لئے ویران ہوگیا۔ پس انہوں نے دربار کو الوداع کہا اور ہندوستان میں مقدس مقامات کی زیارت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ہندوستان میں اُن کی ملاقات کئی روحانی معلمین اور صوفیائے کرام سے ہوئی۔ اسی دوران انہوں نے حضرت معین الدین چشتیؒ کے دربار پر حاضری دی۔ رات کے وقت جب وہ ایک فقیر کا گیت سُن رہے تھے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے:

> ''وہ ایک چٹائی پر بیٹھے تھے اور اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ انہوں نے سوچا کہ آج تک انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے انہیں نجات دلانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دنیا کسی ایسے سٹیج کا نام نہیں ہے جس پر انسان کو محظوظ کرنے کے لئے کھیل تماشے ہو رہے ہوں۔ دنیا ایک بازار کا نام نہیں جو انسانی خواہشات اور بھوک مٹانے کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کو پورا نہ کرے۔ دنیا ایک مکتب ہے۔۔ ایک سکول ہے جہاں ہم نے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اِس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔۔ بالفاظِ دیگر اُن کے سامنے کتابِ ہستی نے ایک باب وا کر دیا اور وہ اِس میں داخل ہو گئے''۔ ایضاً 89

وہ مسلسل سفر میں رہے اور مختلف مقامات پر موسیقی پر لیکچرز دیتے رہے۔ ایک دن وہ ایک براہمن سے ملے جو ایک بہت بڑا شاعر اور روحانی علوم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ تنہا تھے تو براہمن نے حضرت عنایت خانؒ سے کہا:

> ''آپ مغرب کا سفر کریں۔۔ وہاں آپ وہ کچھ کر سکتے ہیں جو کچھ یہاں ممکن نہیں۔ اِس سے تمہیں دولت نہیں ملے گی۔ لیکن تمہارے کام کی اہمیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہوگا۔ تم ہمت کرو خدا تمہارا حامی و ناصر ہوگا''۔ ایضاً 109

اِس وقت حضرت عنایت خانؒ اپنی روحانی تلاش کی معراج پر تھے۔ وہ ایک لمحے میں خالص شعور تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ سوانح عمری میں لکھا ہے:

> ''جونہی وہ اپنا میوزک شروع کرتے وہ مادی شعور سے بلند ہونے لگتے۔ صرف یہ نہیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ اُن کا میوزک سننے والوں کی ایک بہت

Marfat.com

بڑی تعداد بھی وجد میں آ جاتی۔ وہ سب زمان و مکان کی حدود سے بلند ہو جاتے اور بے انانیت اور بے وقتگی کا لطف اٹھاتے۔ میوزک ختم کرنے کے بعد حضرت عنایت خانؒ کیف اور سُرور میں ڈوبے رہتے اور دنیوی مظاہرات، احساسات اور ضروریات دھند میں ڈوب جاتیں''۔ [ایضاً]

اس طرح میوزک نے انہیں دنیوی تکمیل سے آشنا کیا اور اب ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ [ایضاً 111]

اب انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے وہ تمام میڈلز کیوں کھو دیے تھے جو انہیں میوزک میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں دیے گئے تھے۔ دراصل گذشتہ چند برسوں میں وہ سب لوگ بھی انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے جنہوں نے اُن کی رہنمائی فرمائی تھی۔ اُن کے نانا جان، والد صاحب، والدہ محترمہ اور مرشد۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کچھ بھی انسان کی ملکیت نہیں ہے۔ اب اُنہیں مرشد کا فرمان سمجھ میں آ رہا تھا:

> ''آگے بڑھو میرے بچے! موسیقی کی قوت سے مغرب اور مشرق کو ہم آہنگ کرو! تصوف کی دانش کو دنیا میں عام کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسی مقصد کے لئے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑی مہربان اور رحم کرنے والی ذات ہے''۔ [ایضاً]

پس اب آخری تیاری کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ اُن کے فرض کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا تھا۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُن کا راستہ صاف تھا۔ 13 ستمبر 1910 وہ دن تھا جب وہ ہندوستان سے امریکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اُن کے بھائی محبوب خان اور کزن محمد علی خان اُن کے ساتھ تھے۔ لیکن انہیں صرف ذاتِ خداوندی پر کامل بھروسہ تھا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں انہوں نے لکھا ہے:

''قسمت مجھے شاعری اور موسیقی کی دنیا سے صنعت و تجارت کی دنیا میں لے جا رہی تھی۔ میں نے مادرِ وطن کو الوداع کہا جو شاہِ خاور کی سرزمین تھی اور امریکہ روانہ ہوا جہاں مجھے آئندہ زندگی گذارنی تھی۔ [121]

مغربی دنیا میں تصوف کے پیغام کے فروغ کا کام شروع ہو چکا تھا۔

Marfat.com

باب 3

مغرب میں تصوف

امریکہ میں جونہی حضرت عنایت خانؒ کی نظر مجسمہ آزادی پر پڑی، انہوں نے فرمایا:

''مادی آزادی کے حصول کے بعد روحانی آزادی کا انتظار ہے!'' سوانح عمری 123

نیویارک میں داخل ہوتے ہی انہیں محسوس ہو چلا تھا کہ وہ ایک مختلف دنیا میں داخل ہو چکے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر چیز گردش میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ بھی ساکن نہیں تھا۔ ایضاً

حضرت عنایت خانؒ مغرب میں ہم آہنگی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ اس لئے انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں اور ماحول کے مطابق ڈھال لیں گے۔ وہ تصوف کا پیغام لے کر وہاں پہنچے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اُن کا پہلا ذریعہ موسیقی ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بھائی محبوب خان اور محمد علی خان اُن کے ساتھ تھے۔

دراصل موسیقی کے جادو سے ہی انہوں نے مغرب میں اپنے لئے جگہ پیدا کی۔ انہیں ہر جگہ سے دعوت نامے موصول ہونے لگے کہ وہ آئیں اور ہندوستانی موسیقی پر بات کریں۔ سب سے پہلے انہیں کولمبیا یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا اور بعد ازاں UCLA اور برکلے یونیورسٹی میں انہوں نے ہندوستانی میوزک پر لیکچرز دیے۔ اس طرح اُن کے رابطے بڑھتے گئے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ دیارِ مغرب اُن کی موسیقی کا کڑا امتحان لے رہا ہے۔۔ مغرب میں ہندوستانی میوزک پیش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کرنسی بینک میں کوئی قدیم ترین سکہ لے کر پہنچ جائے۔ ایضاً 123

یہ احساس ہمیشہ اُن کے ساتھ رہا کہ وہ مغرب میں تصوف کی روشنی لے کر آئے ہیں لیکن اِس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ سب سے پہلے انہیں مغربی دنیا کے متعلق جاننا تھا۔۔ یہاں کے لوگوں کی نفسیات سے واقف ہونا تھا اور اُس کے بعد ہی کہیں وہ اپنے مشن کا آغاز کر سکتے تھے۔

Marfat.com

مغرب میں انہیں یہ کام جس قدر دشوار لگ رہا تھا اُس کا وہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ایضاً179
ان مشکلات کی کئی وجوہات تھیں۔

اس سلسلے میں اولین مشکل یہ تھی کہ اُن کی مدد کے لئے کوئی ادارہ یا تنظیم موجود نہیں تھی۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں تھے جہاں نہ کوئی اُن کا واقف تھا اور نہ ہی کوئی سمجھنے والا تھا۔ اِس صورتِ حال میں مالی وسائل کی کمی مغرب میں اُن کے لئے مزید مشکلات کو جنم دے رہی تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

''غربت میری بدترین دشمن ثابت ہو رہی ہے''۔ ایضاً185

ان کی زندگی میں کئی ایسے مواقع پیدا ہوئے تھے جب وہ اپنے لئے بہت زیادہ دولت جمع کر سکتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ روحانی اصولوں پر ڈٹ کر ہی کردار کی طاقت اور آزادی کا حصول ممکن بنا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس رویے کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''کئی لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ایک صوفی اپنے لئے دولت کے انبار کیوں نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ اُسے بھی دولت کی ضرورت پڑتی ہے جس طرح مجھے مغرب میں اِس کی ضرورت رہی تھی۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ نہیں پایا کہ میں دولت کی خواہش کروں تو میں دولت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حوالے سے میری زندگی ایک پرندے کی زندگی کی مانند ہے۔ جو زمین پر دانہ چگنے کے لئے اترتا ہے لیکن اُسے حقیقی لُطف آسمانوں میں اڑنے سے ملتا ہے۔ اگر کوئی اُس پرندے سے کہے کہ ہوا میں دانے نہیں ہیں۔۔ زمین پر رہو اور خوب کھاؤ۔ وہ پرندہ جواب دے گا ''نہیں مجھے چند دانوں کی ہی ضرورت ہے۔۔ زمین پر دانوں کے ڈھیر مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے کیونکہ میں اُن کی خاطر اڑان کے لطف کی قربانی نہیں دے سکتا''۔ اِس پرندے کی طرح میں بھی دنیا بھر کی دولت کی خاطر اپنی حقیقی دل چسپیوں کی قربانی نہیں دے سکتا''۔ ایضاً185

مادی مسائل کے علاوہ مغربی اذہان کا مادی جنون بھی ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔اس کے علاوہ اسلام کے خلاف بے جا تعصب بھی اُن کی راہ میں حائل تھا۔اگر چہ وہ تصوف کا عالمگیر پیغام لے کر آئے تھے لیکن وہ محسوس کر رہے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں صوفیانہ افکار اور تصورات کا خوف موجود تھا۔اس کے علاوہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی اذہان میں جنم لینے والے قوم پرستانہ رجحانات بھی اُن کی راہ میں رُکاوٹ بنے رہے۔ ایضاً180

آخر میں انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغربی اذہان اتباع (discipleship) کے تصور سے نہ صرف ناواقف ہیں بلکہ اِسے شدومد سے رد کرتے ہیں۔لیکن تصوف کی راہ پر چلنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس راہ پر رہنما۔۔مرشد کامل کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔انہوں نے محسوس کیا کہ مغرب میں روحانی معلم یا مرشد کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔وہاں محض استاد ہے۔۔پروفیسر ہے اور بس۔وہ لوگ جو مرشد یا روحانی گرو کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں ایسا نہیں کر پاتے۔ ایضاً187

تاہم کچھ عرصہ بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ خواتین نہ صرف اُن کے پیغام کو توجہ سے سنتی ہیں بلکہ اُسے سمجھنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خواتین فطرتاً زود حِس اور درون بین ہونے کی وجہ سے فوراً ردِعمل ظاہر کر دیتی ہیں اور دنیوی مصروفیات سے بہت حد تک آزاد ہونے کی وجہ سے داخلی دنیا میں بہت دلچسپی لیتی ہیں۔اس لئے مغرب میں حضرت عنایت خانؒ کے مشن کی کامیابی میں خواتین نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح امریکہ میں اُن کے لئے سب سے زیادہ معاون ثابت ہونے والی بھی ایک خاتون تھیں۔اُن کا نام ادا مارٹن تھا لیکن بعد میں ان کا نام رابعہ رکھا گیا۔جب 1912 میں حضرت عنایت خانؒ انگلستان روانہ ہوئے تو اُن کی بیعت کی شاندار تقریب ہوئی اور مرشدہ رابعہ کو امریکہ میں صوفی پیغام کا امانتدار بنایا گیا۔

اِس وقت تک حضرت عنایت خانؒ یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ صوفیانہ پیغام کی نشر واشاعت کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔اس کے برعکس مغرب میں رابطوں کے قیام میں اُن کا قیمتی وقت ضائع ہو رہا تھا۔اسی دوران اُن کی ملاقات ایک ایسی نیک روح سے ہوئی جس نے آگے چل کر اُن کی شریکِ حیات بننا تھا۔اُنہیں محسوس ہو رہا تھا کہ انسانی فطرت سے آشنا ہونے کے لئے انہیں ایک گھر کی ضرورت ہے تا کہ اُن کی جذباتی نشوونما ہو سکے اور وہ انسانی فطرت کا قریب سے مطالعہ کر سکیں۔ ایضاً183

Marfat.com

آوارہ بیکر اُن سے موسیقی سیکھا کرتی تھیں۔ وہ حضرت عنایت خانؒ سے بہت متاثر ہوئیں۔ پہلے پہل اُن کے خاندان نے انہیں حضرت عنایت خانؒ کے پیچھے انگلستان جانے سے روکا۔ تاہم انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان کو راضی کرلیا اور اُن کی شادی 1912 میں لنڈن میں ہوئی۔

حضرت عنایت خانؒ کو خداوندِ کریم نے اولاد کی نعمت سے نوازا۔ اُن کے چار بچوں میں سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام ولایت عنایت خان اور ہدایت عنایت خان رکھے گئے جب کہ بیٹیوں کو نور النسا اور خیر النسا نام دیے گئے۔ نور النسا نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران فرانسیسی مزاحمتی تحریک میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ جبکہ حضرت عنایت خانؒ کے دونوں بیٹوں نے مغرب میں تصوف کی نشر و اشاعت میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

جب حضرت عنایت خانؒ دوسری مرتبہ انگلستان پہنچے تو اِس بار اُن کی مشکلات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس دوران انہیں محض چند لوگوں سے رابطہ کرنے کا موقع ملا لیکن اُن کے میوزک کو کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی۔ اس دوران انہیں بتایا گیا کہ انہیں فرانس کا رخ کرنا چاہیے لہٰذا وہ 1913 میں پیرس روانہ ہو گئے۔

فرانس میں وہ بہت سے لوگوں سے ملے جو نہ صرف ہندوستانی میوزک میں دل چسپی رکھتے تھے بلکہ تصوف کی ابجد سے بھی واقف تھے۔ یہاں اُن کی ملاقات فرانس کے مشہور موسیقار کلاوڈ ڈیبوسی سے ہوئی جو اس وقت ہندوستانی موسیقی، خاص طور پر راگ راگنیوں، میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ حضرت عنایت خانؒ سے ملاقات نے اُس کی آنے والی کمپوزیشنز کو بہت متاثر کیا۔[2]

فرانس میں قیام کے دوران ہی حضرت عنایت خانؒ کو روس جانے کا موقع ملا۔ تاہم وہ روس کے تجربے کو انتہائی ناخوشگوار تجربہ قرار دیتے تھے۔ کیونکہ اُنہیں اور اُن کے بھائیوں کو صرف وہاں کے امیر خاندانوں کے سامنے میوزک بجانے کا موقع دیا گیا۔

> ''مجھے یوں محسوس ہوا کہ خدا انقلابِ روس سے قبل مجھے روس بھیجنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں روس کبھی نہ جاتا۔ تاہم وہاں جا کر مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ خدا ہر جگہ برابر بٹا ہے''۔ سوانح عمری 135

اس سفر کا آغاز نا خوشگوار ضرور تھا لیکن سفر کے اختتام پر کامیابی اُن کے لئے باہیں کھولے کھڑی تھی۔ انہیں بالاخر امپیریل کنزرویٹری آف میوزک میں مدعو کیا گیا جہاں لوگوں نے اُنہیں دل کھول کر داد دی۔ یہاں بہت سے لوگ اُن کے دوستوں کی صف میں شامل ہوئے اور ان میں روس کے عظیم لکھاری لیو ٹالسٹائی کا بیٹا سرتیج ٹالسٹائی بھی شامل تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح مذہب اور مذہبی فلسفے میں گہری دل چسپی رکھتا تھا۔ حضرت عنایت خانؒ کی پہلی کتاب ''روحانی آزادی کا صوفیانہ پیغام'' روسی زبان میں ترجمہ ہو کر روس میں ہی شائع ہوئی۔ اس کے بعد اُن کی ملاقات روس کے صفِ اوّل کے موسیقار سکریابن سے ہوئی۔ سکریابن حضرت عنایت خانؒ سے متفق تھے کہ مغربی موسیقی مشرقی موسیقی سے بہت کچھ سیکھ کر اپنا دامن وسیع کر سکتی ہے۔ ایضاً 138

حضرت عنایت خانؒ کو یقین تھا کہ مغرب اور مشرق کے سروں کو ہم آہنگ کرنے سے عالمگیر میوزک کا جنم ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

1914 میں جب وہ روس سے روانہ ہوئے تو اُس وقت تک وہ اس ملک اور یہاں کے باسیوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ انہیں، خاص طور پر، روسی زبان بہت پسند آئی تھی جو اُن کے بقول ہندوستانی سے ملتی جلتی تھی۔ روس کے لوگوں کی تصوریت پسندی، فنکارانہ ذوق اور رجحانات، سریت پسندی اور فلسفیانہ مذاق نے انہیں بہت متاثر کیا۔ ماسکو میں ایک مسلمان رہنما کے گھر پر اُنہوں نے اسلام اور عالمگیر اخوت کے موضوع پر لیکچر دیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ روس میں ایک مسلمان بھائی کے گھر قیام کے دوران انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر میں نہ ہوتے ہوئے اپنے گھر میں موجود ہیں۔ ایضاً 138

اسی برس، 1914 میں ہی وہ فرانس واپس آ گئے اور پیرس میں انہوں نے میوزیکل کانگریس میں شرکت کی۔ کچھ دنوں بعد پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو وہ اپنے خاندان سمیت انگلستان واپس آ گئے اور جنگ کے دنوں میں لنڈن میں قیام پذیر رہے۔ یہ نہایت مشکل برس تھے۔ اُنہوں نے اپنی سوانح عمری میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ مشکل حالات میں خداوندِ کریم نے اُن کی کس طرح مدد کی۔

''ایک مرتبہ وہ ٹاؤن پہنچے تو اُنہیں لینے کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ جنگ کی وجہ سے شہر کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور ارد گرد کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ بہت سا ساز و سامان لئے سڑک پر اکیلے کھڑے تھے۔ چند لمحے رُک کر رہنے کے بعد وہ اس امید پر آگے بڑھے کہ کوئی نہ کوئی اُن کی مدد کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اتنے میں انہیں کچھ لوگ سڑک پر چلتے ہوئے دکھائی دیے۔

Marfat.com

اُن کے قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ سب شراب کے نشے میں دُھت تھے اور اُن کے درمیان دشنام طرازی کا مقابلہ زوروں پر تھا۔ جونہی وہ اُن کے قریب پہنچے اُن میں سے ایک نے کہا:

''ہوں یہ کیا چیز ہے؟''۔۔

اس سے پہلے کہ حضرت کوئی جواب دیتے اُن سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ مرشد نے اُن پر نگاہ ڈالی تو ایک بجلی سی کوند گئی اور وہ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اُس جگہ کے بارے میں پوچھا جہاں وہ جانا چاہتے تھے۔

''ہم آپ کو لے جاتے ہیں''۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا اور حضرت سے کچھ سامان لے لیا۔ اس کے بعد باقی لوگ بھی اُس کے ساتھ شامل ہو گئے اور حضرت کا سامان اٹھا کر آگے چل پڑے۔ حضرت نے وینا اپنے ہی پاس رکھی اور وہ سب حضرت کا سامان اٹھائے اس طرح آگے بڑھ رہے تھے جیسے کسی مقدس فرض کی ادائیگی میں مصروف ہوں۔ اُن میں مدہوشی کے تاثرات غائب ہو چکے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اُن پر کسی طاقت کی چھاپ ہے اور وہ اپنا فرض پورا کرنے سے قبل بول بھی نہیں سکتے''۔ ایضاً 60-259

حضرت عنایت خان محسوس کر رہے تھے کہ جنگ نے لوگوں کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر شخص جنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور امن کے بارے میں کی جانے والی بات کوئی بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تاہم اسی دوران اُن کے لئے چند لیکچرز کا اہتمام کیا گیا جن میں انہوں نے ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیتے ہوئے امن اور عالمگیر یگانگت کی بات کی۔

اسی دوران اُن کی ملاقات چند ایسے لوگوں سے ہوئی جنہوں نے بعد میں اپنی زندگیاں تصوف کے لئے وقف کر دیں۔ اِن میں ایک خاتون Goodenough بھی شامل تھیں جنہوں نے مغرب میں سلسلہ چشتیہ کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اُن میں حضرت عنایت خانؒ کو روحانی اتباع کا وہ جذبہ نظر آیا جو مغرب میں کم یاب تھا۔ اِن کے علاوہ مس سینسبری گرین نے عالمگیر عبادت کے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شبانہ روز کام کیا۔ تصوف کا پیغام رفتہ رفتہ پھیلنے لگا۔ اسی دوران حضرت عنایت خانؒ کی چند کتابیں شائع کی گئیں، تصوف کے سلسلے کو قانونی شکل دی گئی۔

اور صوفی سنٹرز کا قیام عمل میں آیا۔ تاہم اب بھی حضرت عنایت خانؒ یہ محسوس کر رہے تھے کہ مغربی اذہان وقلوب کی آبیاری کے لئے بہت سا وقت درکار ہے۔

1918 میں جنگِ عظیم اوّل کے مہیب سایے تمام ہوئے اور چشمِ فلک نے ایک بار پھر امن کا دور دیکھا۔ تاہم حضرت عنایت خان محسوس کر رہے تھے کہ برطانیہ کے حالات بد سے بدترین ہو چکے تھے۔ ''جنگ کے ضمنی اثرات نے لوگوں کے دلوں سے محبت کی گرمی چھین لی تھی اور اُن کی رگوں میں خون بے حسی کے جاڑوں نے جما دیا تھا''۔ ایضاً147

یہ دیکھتے ہوئے انہوں نے بین الاقوامی صوفی تحریک کا ہیڈ کوارٹر جینوا سوئٹزر لینڈ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ خود پیرس منتقل ہو گئے۔ فرانس میں تصوف کے پیغام نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ اب تصوف اور عالمگیر اخوت کے شیدائیوں کا دائرۂ کار دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔ ایک عشرے کے دوران انہوں نے فرانس کے ہر اہم مقام پر تصوف کا پیغام مزاجِ عوام کیا، کئی یورپی ممالک کے دورے کئے اور امریکہ میں بھی لیکچرز کی ایک سیریز مکمل کی۔

امریکہ میں انہیں یوں لگا کہ یہاں امن وآشتی اور محبت کا پیغام سننے کے لئے لوگوں کو تیار کرنا مشکل ہے۔ ''مجھے یوں لگ رہا ہے کہ ہر طرف بھاری بھرکم نقارے بج رہے ہیں اور میں سیٹی بجا رہا ہوں''175۔ ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تصوف کے پیغام کی نشرواشاعت بھرپور انداز میں کر پائیں۔۔ ورنہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا''۔

جب وہ دوسری بار امریکہ پہنچے تو اِس بار انتظامات قدرے بہتر تھے۔ جب وہ آؤسٹریا ہوٹل کے ہال میں پہنچے تو لاتعداد صحافی موجود تھے اور ہزاروں افراد اُن کا لیکچر سننے کے لئے جمع تھے۔ انہوں نے اس لیکچر کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کراتے ہوئے فرمایا:

> ''اِن میں سے کچھ اشتہارات کی نمائش کے لئے جمع ہوئے تھے۔ کچھ صحافی حضرات یہ حیران کن خبر رپورٹ کرنا چاہتے تھے کہ دورِ الحاد میں کوئی مذہب پر بات کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں کو تجسس ہانک کر لایا تھا۔ اور کچھ ہال میں داخل ہونے کے بعد پانچ منٹ سے زیادہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اِس کے باوجود میں اِسے کامیاب لیکچر کہوں گا۔ کم از کم میں جان گیا ہوں کہ یہاں کے لوگ کیا چاہتے ہیں۔۔ سچ یا جھوٹ۔ میرا ایمان ہے انسان روحانی یا لاشعوری طور پر سچ کا متلاشی ہے۔۔ لیکن وہ ہمیشہ جھوٹ سے ہی لطف اندوز ہوتا ہے'' ایضاً205

Marfat.com

لیکن ہم اُن کے دورۂ امریکہ کو اِس لئے بھی کامیاب تصور کرتے ہیں کیونکہ جو کچھ حضرت عنایت خانؒ نے اپنے لیکچرز کے دوران فرمایا وہ جامعیت، گہرائی اور سادگی میں اناپ رفعتوں کا حامل ہے۔ فلسفہ، نفسیات، تصوف، مذہب۔۔ جس موضوع کو بھی انہوں نے چھوا سننے والوں کو اِس میں الوہی دانش کی جھلک اور مہک ملی۔ اس دوران کئی مریدوں نے بیعت کی۔ اسی دوران صوفی تحریک کے کئی قومی مراکز منظرِ عام پر آئے اور 1923 میں، جینوا میں، بین الاقوامی صوفی تحریک کا ہیڈ کوارٹر مکمل ہو چکا تھا۔

اس وقت تک حضرت عنایت خانؒ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو چکا تھا اور ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن نبھانے کے لئے انہیں موسیقی کی قربانی دینی پڑی۔۔ جو ایک بہت بڑی قربانی تھی۔ انہوں نے اپنے اِس فیصلے کی وضاحت کچھ یوں کی:

''میں نے موسیقی کی قربانی اس لئے دی ہے کیونکہ جو کچھ میں نے اِس سے پانا تھا پالیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دیں۔ اور میں نے اُس کی راہ میں موسیقی کی قربانی دی ہے۔ موسیقی جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ میں نے گیت کمپوز کئے۔۔ گائے اور وینا سے سُر نکالے۔ موسیقی نے مجھے اس قابل بنایا کہ اِس کائنات کے سُروں کو سمجھ سکوں اور مادی دنیا سے بلند ہو کر حقیقت کے سُر تال پر جھوم سکوں۔ اس کے بعد ہر روح میرے لئے موسیقی کا ایک سُر بن گئی۔ ہر انسان میرے الفاظ پر کھنچا چلا آیا۔ اب میں موسیقی کے آلات پر نہیں انسانی روح پر سُر نکالنا چاہتا ہوں۔ اب میں ہر لفظ کی موسیقیائی قدر سے واقف ہوں۔ میں ہر سوچ۔۔ ہر فکر کے ترنم سے واقف ہو چکا ہوں۔ میں ہر خیال میں۔۔ ہر جذبے میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہوں۔ میں ہر حقیقت کی تشریح آسان الفاظ میں کر سکتا ہوں۔۔ لیکن صرف اُن کے لئے جنہوں نے میرے سُروں کو سمجھا ہے۔ میں نے اُس وقت تک وینا سے سُر نکالے جس وقت تک میرا دل اِس مترنم آلے میں نہیں بدل گیا۔ اِس کے بعد میں نے اپنا یہ آلا سب سے بڑے موسیقار کو سونپ دیا۔ کائنات میں خداوندِ کریم سے بڑا موسیقار اور کوئی نہیں ہے۔ جب میں نے یہ جان لیا۔۔ میں اُس کی بانسری بن گیا۔ وہ جب چاہتا ہے اپنے اس آلے کو بجانا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ مجھے اُس موسیقی کی داد دیتے رہے ہیں جس کا بجانے والا میں نہیں تھا۔ یہ اُس عظیم موسیقار کا میوزک تھا جو ہر وقت اپنے بربط سے نئے سُر نکال رہا ہے۔[4]

Marfat.com

زندگی کے آخری دنوں میں، جب وہ واپس ہندوستان تشریف لے گئے تھے، انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے ساتھ دفن کیا جائے۔ وفات کے بعد اُن کی اس خواہش کے احترام میں انہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ حال ہی میں بین الاقوامی صوفی تحریک نے اُن کی درگاہ کو وسعت دے کر اِس کی تزئین و آرائش کی ہے۔ درگاہ پر سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ درگاہ کے پرسکون اور تشویق آمیز ماحول میں باقاعدہ مراقبے کا اہتمام ہوتا ہے اس کے علاوہ یہاں رہنے والے غریب لوگوں کے لئے سماجی فلاح و بہبود کا کام بھی باقاعدگی سے جاری ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے پس منظر میں حضرت عنایت خانؒ کی آخری آرام گاہ اس بات کی علامت ہے کہ چشتیہ سلسلے کا فیض صدیوں سے جاری ہے اور حضرت عنایت خانؒ کا وہ روحانی پیغام جو مغرب تک پہنچا تھا ابھی تک لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ بلاشبہ حضرت عنایت خانؒ کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ وہ سب کچھ نہیں بتا سکتا جو انہوں نے مغرب کو دیا ہے۔ ہم اِسے حضرت کی تعلیمات کا خلاصہ نہیں کہہ سکتے۔ اس باب کے آنیوالے حصے میں ہم اُن کے چند مریدوں کے تاثرات پیش کر رہے ہیں جنہیں سمر سکول میں اُن کے قرب اور رہنمائی کا شرف حاصل ہوا تھا۔

1۔ یادداشتیں:

مغرب میں حضرت عنایت خانؒ ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں روحانی انقلاب کا باعث بنے۔ عظمت فیبر کو 1923 میں ایک دوست جنیوا میں حضرت عنایت خانؒ کے پاس لے گئیں۔ اس دوران فیبر سوئٹزر لینڈ میں بحالیٔ صحت کی غرض سے موجود تھیں اور کچھ ذاتی مسائل پر غور و خوض کر رہی تھیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''میں جنیوا میں اُس رنگا رنگ خزاں کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ یہ میرے باطنی انقلاب کے دن تھے۔ اس تبدیلی کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں مرشد کے سامنے جا کر بیٹھی اور انہوں نے مجھ پر پہلی بار نگاہ ڈالی۔ میں اُس پہلی ملاقات کے بارے میں بتانا بھی چاہوں تو نہیں بتا سکتی کیونکہ جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ ماورائے کلام ہے۔ مجھے کسی ایسی چیز نے چھو لیا

Marfat.com

جس کی تمنا مجھے ہمیشہ سے تھی۔ میں نے جان لیا کہ وہ انسان میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔۔وہ میری روح کی گہری خواہشات کا بھی علم رکھتا ہے۔ گذشتہ برسوں کی کھوج، افسردگی اور تنہائی سب مٹ گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ ایک نرم وگداز ہاتھ نے میرے سارے دُکھ چن لئے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ میری زندگی نے نیا جنم لیا ہے۔اسی ہفتے میں نے اُن کے ہاتھوں پر بیعت کی۔مرشد نے مجھ سے کہا کہ میں جنیوا میں ہی رہوں تا کہ ہیڈکوارٹر میں کلاسز اٹنڈ کرسکوں۔وہ میری روحانی پیاس کی گہرائیوں سے واقف ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ میں تصوف کے لئے اپنی زندگی وقف کرسکتی ہوں۔

جب مرشد بہار کے دنوں میں دوبارہ جینوا آئے تو انہوں نے مجھے صوفیانہ نام دینا تھا۔دراصل مجھے اس بات کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک ملازمہ نے غلطی سے مجھے سب کچھ بتا دیا۔اُس دن میری مرشد سے ملاقات نہ ہوسکی اور میں اُن سے اِس نام کا مطلب نہ پوچھ سکی۔اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی میں نے اپنا نام اس دعا کے اضافے کے ساتھ دہرانا شروع کردیا:

خدا کی عظمت میری دیکھ بھال کرے۔۔

اے خدا اپنے نور سے میرا سینہ منور کردے!

میں کافی دیر تک یہ ورد کرتی رہی۔میں بہت خوش تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے چاروں جانب خدا کی رحمتوں کی برسات ہو رہی ہے۔ تاہم میں اِس کی وجہ نہیں جان پائی تھی کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔بعدازاں مرشد مسکراتے ہوئے تشریف لائے:

''تو اُس نے وہ راز کھول دیا ہے۔اُس نے آپ کو آپ کا نام بتا دیا ہے''۔۔مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس نام کا مطلب کیا ہے؟''۔۔کسی نے پوچھا۔

''عظمت کا مطلب ہے خدائی رفعت ۔۔ بلندی''۔۔انہوں نے جواب دیا۔
اب وہ راز راز نہیں رہا تھا۔ میں بغیر جانے اپنا نام دھرائے جا رہی تھی اور خدائی رحمتوں کی برکھا جاری تھی ۔ یہ سب کیسے ہوا۔۔کیا یہ ممکن تھا؟
سمر سکول میں گذرا ہوا وقت میرے لئے بہت قیمتی تھا۔ آخر کار میں نے مرشد سے اجازت چاہی۔ اس دوران میرے تجربات میرے فہم وادراک سے ماوراو بلند تھے۔ میں نے مرشد سے کہا:
''میرے لئے یہ سب خواب کی طرح ہے''۔اس پر مرشد نے جواب دیا:
''یہ سب خواب ہی ہے''۔
اسی لمحے میں نے جان لیا کہ ہماری پوری زندگی غیر تکمیل شدہ حالت سے تکمیل کا سفر ہے۔۔ زندگی کسی غیر حقیقی خواب کا حقیقت سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے۔
سمر سکول میں گذرے ہوئے آخری دن میری زندگی کے خوبصورت ترین دن تھے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ مرشد کی ہستی ہمارے اوپر خدائی نور کی طرح برس رہی ہے۔ ہم اس تجربے سے اُس وقت گذرتے جب اتوار کے دن مرشد ہمیں مراقباتی استغراق اور خاموشی کا درس دیتے۔ میں ان مراقباتی شاموں کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ زمین پر بسنے والے بہت کم انسانوں کی زندگی میں ایسے کریم لمحات آتے ہیں۔ ہم خدائی فضل اور روحانی تشویق کے خاموش لمحات مرشد کی موجودگی میں گذارتے۔ مرشد ہم پر نگاہ ڈالتے اور ہمیں آزادی اور تطہیر کا گہرا احساس گھیر لیتا۔ بعض لوگوں کے خیال میں، گذشتہ سمر سکول کے دوران، ہم نے وہ سب پالیا تھا جو کچھ زندگی ہمیں دے سکتی تھی''۔[5]

سر کاروان سٹولک یورپ میں حضرت عنایت خانؒ کے ساتھ رہے۔ ایک لیکچر کے بعد سٹولک اور حضرت عنایت خانؒ کے درمیان درج ذیل گفتگو ہوئی جو قارئین کے لئے گہری دلچسپی کا باعث بنے گی:

Marfat.com

''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری پوری زندگی کو اُن لیکچرز پر مشتمل سمجھا جائے جو میں یورپ کے طول وعرض میں دے رہا ہوں۔۔ میرا پیغام ایک پردہ ہے جب کہ میرا کام صرف وہ آنکھ دیکھ سکتی ہے جو پردوں سے پار دیکھ سکتی ہے۔۔ کسی اور دنیا میں۔۔ کسی اور آیام میں۔ اگر میں اپنے سننے والوں کی گنتی کرنا شروع کردوں تو مجھ سے زیادہ مایوس آدمی اِس دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ میں جان سکتا ہوں کہ میرے سامعین میں سے کسے کونسا روحانی عارضہ لاحق ہے۔ اور میں اُن کے سوالات کے جواب بھی دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاہم میرا حقیقی مقصد یورپ کی نظر بلند کرنا ہے۔ انہیں روحانی ارتعاش کی بلندیوں سے آشنا کرنا ہے۔ اسی لئے میں ہروقت سفر میں ہوں''۔[6]

وان سٹولک اپنی یاداشتوں میں لکھتے ہیں:

''یورپ میں وہ لوگ بھی جن کا مذہب تنقید برائے تنقید اور عمل برائے عمل تھا حضرت عنایت خانؒ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتا جب انہوں نے میرے والد صاحب سے ملاقات کی۔ میرے والد صاحب چاہتے تھے کہ میں اپنے خاندانی کاروبار میں اُن کا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن جب میں مرشد سے ملا تو میرے لئے یہ سب ممکن نہ رہا۔ میں تصوف کا راستہ اپنانا چاہتا تھا۔ اگرچہ میرے والد صاحب کو میرا یہ فیصلہ پسند نہ آیا لیکن پھر بھی انہوں نے اسے قبول کرلیا۔ ایسے آدمی سے ملاقات کی خواہش کرنا، جس نے اُن کے بیٹے کو اس قدر متاثر کیا تھا ایک فطری بات تھی۔ اُن کی خواہش کے احترام میں میں نے حضرت عنایت خانؒ کے قیام وطعام کا بندوبست ہالینڈ میں اپنی رہائش گاہ پر کیا۔

میرے والد صاحب مذہبی یا صوفیانہ خیالات رکھنے والے آدمی نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے انسانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یورپ میں اُس دور کے عظیم فلسفیوں اور مذہبی علماء سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن وہ خود

Marfat.com

ایک توانا ذہن رکھتے تھے اس لئے وہ آج تک کسی کے تصورات اور خیالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔

مرشد کے قیام کی پہلی شام انہوں نے رات کا کھانا میرے والد صاحب کے ساتھ اُن کے سٹڈی روم میں کھایا۔ دونوں کافی دیر تک بند کمرے میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے جبکہ میں اپنے کمرے میں اُن کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ چند گھنٹوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور میرے والد صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے اور میرے ساتھ بیٹھ گئے۔

''میرے بچے! میرے بچے!''۔ انہوں نے پیار سے انگلیاں بستر پر بجاتے ہوئے کہا:

''تمہارے مرشد سے بڑی ہستی سے آج تک میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تم جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ آج میں پہلی مرتبہ ایسے شخص سے ملا ہوں جو اپنی تعلیمات پر سب سے پہلے خود عمل کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پہلے اُس پر خود عمل کرتے ہیں''۔[7]

منیرہ ناوان ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اُن کی پہلی مرید ہیں۔ وہ حضرت عنایت خانؒ کے ساتھ ایک عشائیے کی روداد کچھ یوں سناتی ہیں:

''مجھے اُن کے ہاں کئی مرتبہ کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس بہانے میں اُن کے ساتھ کافی وقت گذارنے میں کامیاب ہوئی۔ میں اس وقت نہیں جانتی تھی کہ عارف کی ایک نگاہ کیا اثر رکھتی ہے۔ پس پہلی رات جب میری نظر اُن سے ٹکرائی تو میں نہ جان سکی کہ اُن کی نظروں نے میرے دل پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس واقعے سے کئی سال بعد جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں تو اُن کی نظریں میرے دل کی تاریکی کے ساتھ جنگ لڑ رہی ہوتی ہیں۔ آج بھی اُن کی آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں اور مجھ پر گہرے سکوت اور طمانیت کی برکھا ہو رہی ہے۔ میں اسی تطہیر آمیز طمانیت پر آج بھی غور کرتی ہوں۔۔ میں اُس رات عشائیے پر کس کی مہمان تھی؟''[8-9]

Marfat.com

سعدیہ وان ٹوپل کے تجربات بھی منیرہ سے مختلف نہیں ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ ایک خوفناک طوفان کے دوران باغ میں کھڑے ہیں۔ سعدیہ اُس منظر کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

''اتوار کے دن وسیوس میں پیرس سے بہت سے مہمان پیرومرشد کے باغ میں اکٹھے ہوئے تھے[10]۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور محکمہ موسمیات کی طرف سے طوفان کی پیشین گوئی بھی ہو چکی تھی۔ ہوا میں طوفانی بوجھل پن پیدا ہوا۔۔ درختوں سے سیٹیوں کی آواز اٹھی اور جھکڑ چلنے لگے۔ پیرومرشد کی بیوی، بھائی، بچے اور لوگ بھاگ کر بڑے کمرے میں چلے گئے۔ سب سے آخر میں میں کمرے کی طرف بڑھی۔ میں اندر داخل ہونے کے لئے فرنچ ونڈو کھول کر اندر داخل ہونے والی تھی کہ میں نے دیکھا کہ مرشد طوفان میں کھڑے گہرے سانس لے رہے ہیں۔۔ جیسے طوفانی قوت اپنے اندر مجتمع کر رہے تھے۔ مُردہ پتے اور گرد اُن کے اردگرد طواف کر رہی تھی۔ اُن کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ طوفان میں کھڑے بالکل ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی سامی پیامبر۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔ اندر مہمان اور بچے شور کر رہے تھے۔ یہ منظر ہمیشہ کے لئے میرے ذہن پر نقش ہو گیا اور بعد میں میں نے اس منظر کو تصویر میں محفوظ کر لیا''۔[11]

رتن ڈی وریز فینز، جو بعد ازاں میری شریکِ حیات بنیں، اپنی عمر کے ابتدائی برسوں میں ہی دائرۂ تصوف میں داخل ہو چکی تھیں۔ 1926 میں اُن کے والدین انہیں سرسینز کے سمر سکول میں لائے تھے جہاں صوفیا دو ماہ کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔ جب اُن کی عمر صرف چھ سال تھی وہ حضرت عنایت خانؒ کے سمر سکول میں موجود تھیں اور اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔

''ابھی میری عمر چھ سال تھی جب میرے والدین مجھے سرسینز کے سمر سکول میں لے آئے۔ میری زندگی میں جو کچھ ہوا وہ سب ماضی کے دھندلکوں میں کھو چکا ہے۔ لیکن سرسینز میں گذرے ہوئے دو ماہ ابھی

تک میری یاداشت میں تروتازہ ہیں۔ وہ ماحول۔۔وہ پھول وہ درخت آج تک مجھے یاد آتے ہیں۔ لیکچر ہال، اُجلا آسمان اور چمکتا ہوا سورج آج بھی میری یادوں کی دنیا میں زندہ ہے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر میں ہی موجود ہوں۔ یہاں گذرے ہوئے دو ماہ میری باقی زندگی کا پس منظر ہیں۔

اس کے علاوہ روحانی سرگرمیاں، لوگ جن کی توجہ کا مرکز حضرت عنایت خانؒ تھے۔۔اور اُن کی شخصیت جس نے ہر چیز کو اُس کے دُرست مقام پر رکھا ہوا تھا۔ایک بچی کے طور پر میں محسوس کررہی تھی کہ اِن دو ماہ کے دوران تصوف کا عظیم پیغام میرے دل کی زمین پر اتر رہا ہے۔ اس قسم کے احساسات اُن بچوں کے دلوں میں بھی بیدار ہوتے ہیں جنہیں اُن کے والدین صوفیائے کرام کی حکایات اور کہانیاں سناتے ہیں۔ مرشد سرسینز میں بچوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے اُن بچوں کے لئے وقت نکالتے جن کے والدین سمر سکول میں موجود تھے۔ وہ جمعے کی سہ پہر کو فضل منزل (فرانس میں مرشد کا گھر) میں ہمیں گفتگو اور موسیقی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مرشد نے ہمیں ارتکاز اور مراقبہ سکھانے کے لئے کچھ کھیل دیے۔ ہم میں سے ایک بچہ اپنا ذہن خالی کرتا اور دوسرا کسی جانور پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ ایک شاندار گیم تھی جس میں بعض اوقات دانش سے زیادہ خوش قسمتی کام آتی تھی۔ میں آج بھی مرشد کی آواز سُن سکتی ہوں:

''اچھا تو وہ کونسا جانور تھا؟''۔۔۔۔۔

مرشد کی شخصیت پر اعتماد۔۔سنجیدگی اور کھیل۔۔کھیل میں شامل ہونے کا لطف اور جیت کا جوش وخروش۔۔اِن سب نے بچوں کی کلاسز کو ایک جشن کا روپ دیا جسے ہم آج تک نہیں بھول پائے''۔[12]

Marfat.com

باب 4

عالمگیر تصوف، روحانی آزادی کا پیغام

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عنایت خانؒ نے خالص روحانی دنیا میں آنکھ کھولی۔۔تصوف کی دنیا۔۔روحانی موسیقی کی دنیا۔اُن کے اولین ماہ وسال کا اثر دائمی اور عالمگیر تھا۔ اُن کے نانا جان نے شمالی اور جنوبی ہندوستان کی موسیقی کو شیر وشکر کیا۔ اس کے علاوہ اُن کے خاندان نے مغربی اور مشرقی موسیقی کو ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ بچپن سے ہی حضرت عنایت خانؒ یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر عقلی علوم ایک ہیں۔۔ اگر عقل ایک مقام پر لے جاتا ہے تو عشق کیوں نہیں۔ اِس لئے انہوں نے مختلف مذاہب کا ہمدردانہ مطالعہ کیا۔ وہ میرٹھی ہندوسکول گئے۔۔وہ دنیا بھر کے عظیم مذاہب کے علما سے ملے جو اُس وقت ہندوستان میں موجود تھے۔

یہ سچ ہے کہ مغل کلچر نے اُن کے ذوق اور فکر کی آبیاری کی۔ انہوں نے مسلم اور ہندو تہذیب کے محاسن کو اپنے تحت الشعور میں جگہ دی۔ اس لئے وہ مشرقی اور مغربی مذاہب کی دھاراؤں کا سنگم مانے جاتے ہیں۔ مذہب کی مغربی دھارا زرتشت سے شروع ہو کر یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے راستے آگے بڑھتی ہے۔ اِس دھارا میں عہدِ عتیق کے مصری مذاہب، یونان اور ایران کے فلسفیانہ اور متصوفانہ افکار کے دریا ایک ہی سمندر میں گرتے ہیں۔ مشرقی دھارا ویدک مذاہب سے پھوٹتی ہے اور غیر براہمن مذاہب کے راستے سے آگے بڑھتی ہے۔ بدھ مت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور مشرق بعید کی روحانی روایات۔۔تاؤمت، کنفیوشس کی تعلیمات اور مہاویر کا کشٹ سبھی مشرقی مذاہب کی صدرنگ روحانی روایت کے امین ہیں۔

مغربی روحانی روایات کا عروج اسلام ہے جبکہ مشرقی روحانی دانش ہندومت میں عروج پر پہنچتی ہے۔ مشرقی مذہبی اور روحانی روایات میں سکھ مت بھی شامل ہے اور گرو گرنتھ صاحب میں فریدؒ، کبیر اور کئی سنتوں کا کلام اسے صوفیانہ نصب العین سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند کی ثقافت نسلِ انسانی کے روحانی معیارات کا سنگم ہے۔ اور یہیں مغرب کے دنیوی، مادی وملحدانہ تصورات کا تریاق دستیاب ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی صد رنگ روحانی تہذیب وثقافت مغربی نظریاتِ حیات کو صدیوں سے للکار رہی ہے۔ اس لئے جب حضرت عنایت خانؒ نے مذہبی اور روحانی دھاراؤں کو یکجا کیا تو انہوں نے مشرق اور مغرب کے درمیان حائل خلیج پر پل باندھنے کی بھی کوشش کی۔ انہوں نے مغرب کو باطنی دنیا کی طرف توجہ دلائی اور مشرق کو خارجی دنیا کے مطالعے کی دعوت دی۔

اسی مقصد کے حصول کے لئے حضرت عنایت خانؒ نے مغرب میں صوفی تحریک کی بنیاد رکھی اور اِس پلیٹ فارم سے تصوف کے عالمگیر پیغام کو پھیلایا۔ صوفی تحریک کا مقصد عظیم صوفی شعراء کے پیغام کی تشریح واشاعت ہے۔ صوفی تحریک صوفیائے کرام کے پیغام کو جدید اذہان کے لئے قابلِ فہم بنا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ صوفیائے کرام کا پیغام آج بھی اتنا اہم ہے جتنا کل تھا۔[1]

مجھے یقین ہے کہ مغربی محقق، ''دانشور'' اور لکھاری اے۔ جے۔ آربیری (A.J. Arberry) تصوف کے عالمگیر پیغام اور حضرت عنایت خانؒ سے اگر واقف ہوتا تو اپنی مشہور کتاب تاریخ تصوف (History of Sufism) کے اختیامیہ میں یہ نہ لکھتا:

> ''ہوسکتا ہے کہ جنید بغدادی، غزالی، ابنِ العربی، جلال الدین رومی کے پیشِ نظر دانشورانہ استدلال کی نوعیت مختلف ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیانہ طرزِ عمل اور روحانی نظریۂ حیات جدید دور کے انسان کے لئے کسی مدقوق اساطیر سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ صوفیانہ زاویۂ نظر اور طرزِ عمل کی ضرورت آج گذرے ہوئے کل کی نسبت زیادہ ہے۔ کیونکہ آج ہم روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں اور تصوف اس دیوالیہ پن کا علاج ہے۔

تاہم ماضی پرستی یا ماضی کو واپس لانے کی کوششوں سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم مسلمان ہوں نہ ہوں۔۔انسانی فکر اور انسانی عمل، بحیثیت انسان، ہماری مشترکہ متاع ہے۔۔ ہم انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس لئے کسی مسیحی محقق کی راہ میں دانشورانہ شوخ چشمی اور تحقیقی بے محل پن کو مخل نہیں ہونا چاہیے اگر اُس کا مقصد اُن سچائیوں کو جاننا ہے جن کی بنیاد پر تصوف نے دنیا بھر کو اس قدر متاثر کیا ہے۔ اگر اُسے اِس سلسلے میں مسلمان بھائیوں سے مدد بھی حاصل کرنا پڑے تو اُسے شرمندگی محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان اور دیگر مذاہب کا دم بھرنے والے مل کر ہی انسان کے روحانی ورثے کے ثمرات سب میں برابر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہم سب مل کر اُس فکر اور عمل کا سراغ پا سکتے ہیں جن کے ذریعے اِس تاریک اور پر خطر دور میں اخلاقی اور روحانی اقدار کا احیاء ممکن ہے''۔[2]

تاہم ہمیں قدیم دور کے صوفیائے کرام کی تحریروں کی تلاش اور تشریح و تفسیر سے آگے بڑھنے کی بھی ضرورت ہے۔ انسان کی روحانی زندگی کی تجدید کی بنیاد کسی زندہ روحانی تحریک پر رکھنا لازم ہے۔ اور وہ نئی تحریک حضرت عنایت خانؒ کے عالمگیر صوفیانہ پیغام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔

حضرت عنایت خانؒ کا پیغام وحدانیت، اتصال اور توازن ہے۔ عالمگیر تصوف دنیا بھر کے عظیم مذاہب کی اٹوٹ وحدت کی راہیں روشن کرتا ہے اور سائنس، فلسفہ، سریت پسندی اور مذہب کو ایک قالب عطا کرتا ہے۔ یہ ہمیں ہماری ہستی کی اندمالی قوتوں سے آشنا کرتا ہے۔۔ ہماری ہستی کا پتہ دیتا ہے اور ہمارا رابطہ الوہی دنیا سے جوڑتا ہے۔ عالمگیر تصوف کا مقصد ہماری خارجی اور داخلی دنیاؤں کو یکجا کرنا اور اِن میں توازن پیدا کرنا ہے۔

تصوف دل اور دماغ، طاقت اور دانش، کام اور آرام کے درمیان توازن کا درس دیتا ہے۔ اس کا زور انسانیت اور ہستی کے احترام پر ہے۔ اِس کا نصب العین محبت ہے، ہم آہنگی اور زندگی کا حسن ہے۔ اِس وقت تصوف کا پیغام مغرب میں پھیل رہا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ نے مغرب کو تصوف کے عالمگیر پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے اور مغرب کو اِس وقت اسی پیغام کی اشد ضرورت ہے۔ تصوف ایک ابدی حقیقت کو آج کے محاورے میں بیان کر رہا ہے جو جس قدر سادہ اُس قدر بحر آسا اور بلیغ ہے۔

حضرت عنایت خانؒ کی تعلیمات اُس نکتے کا پتہ دیتی ہیں جہاں کثیر الاجز اُنقاط ایک کُل میں یکجا ہوتے ہیں۔ اُن کا پیغام مغرب اور مشرق کے فکری محاسن کو سلیقۂ وصل سے روشناس کر رہا ہے۔ اُن کا پیغام روحانی آزادی کا پیغام ہے کسی اِذعانی اور بے لچک اصول کی غلامی نہیں۔ تصوف موضوعی ارتکاز کے ذریعے حقیقت تک پہنچ کر حقیقت بن جانے کا نام ہے۔ اِس لئے ہر کوئی اپنے راستے سے۔۔ اپنی ذات میں ڈوب کر ہستی کی ہستی کا سراغ پا سکتا ہے۔ یہاں راستے نہیں منزل اہم ہے۔

1۔ عالمگیر تصوف وحدت و اتصال کے علم کے حصول اور فروغ کا مقصد لئے ہوئے ہے۔ وحدت و اتصال جو محبت اور دانش کا دوسرا نام ہے۔ عالمگیر تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں محبت کا سیلِ عظیم اٹھے اور منافرت اور تفرقہ پرستی کے سوتے ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائیں۔

2۔ انسان کے دل میں اُس خوابیدہ روشنی اور حقیقت کی تلاش کو زندہ کرنا ہے جو تمام مذاہب کا مقصد ہے۔

3۔ فکر اور نصب العین کی مشارکت کے ذریعے مشرق اور مغرب کو قریب لانا اور دنیا کو عالمگیر اخوت کے شیرازے میں باندھنا تاکہ انسان قومیت اور نسل کی تنگ حدود سے آزاد ہو کر روحانی بنیادوں پر اپنی حقیقی شناخت کی بنیاد رکھ سکے۔

یہ الفاظ، بلاشبہ، تصوف کے پیغام کی تشریح کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تصوف کی روح تجربہ ہے۔ وہ تجربہ جو ہمیں الفاظ اور افکار سے بہت دور لے جاتا ہے۔ یہ تجربہ روحانی نوعیت کا ہے جسے الفاظ کی بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ یہ واردات ہمارے لئے مشیتِ ایزدی میں مٹ جانے اور خدائی تخلیق کے ساتھ ایک ہونے کا دروازہ کھولتی ہے۔

عالمگیر تصوف اور بین الاقوامی صوفی تحریک کا نصب العین حضرت عنایت خانؒ مندرجہ ذیل اقتباس میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''موجودہ دور میں صوفی تحریک کا مقصد دنیا بھر کے افراد، اقوام اور نسلوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کو جنم دینا اور اُن لوگوں کی مدد کرنا ہے جو حقیقت کی تلاش میں ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد انسانی روح میں خدائی شعور کی تلاش ہے اور یہی صوفیانہ تعلیمات کی منزل ہے۔

Marfat.com

مشرق اور مغرب کے درمیان حائل خلیج اور مسلمانوں اور دینِ عیسوی کا دم بھرنے والے لوگوں کے درمیان پلنے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے تصوف کی تعلیمات مغرب میں متعارف کروائی گئی ہیں۔ تصوف بحیثیت روحانی دبستان مغرب میں متعارف ہوا ہے جس سے اسلام کی عالمگیریت اور جمہوری روح کا بھرپور تعارف مقصود ہے۔ سریت پسندی دنیا بھر کے مذاہب کی روح رہی ہے لیکن تصوف کا پیغام ایک الگ روایت ہے۔ یہ محض دبستان نہیں ہے۔۔ یہ طرزِ حیات ہے۔ یہ تمام انسانیت کے دکھوں کا مرہم ہے۔

اگر کوئی اِسے مذہب سمجھنا چاہے تو تصوف مذہب ہے۔ اگر کوئی اِس سے دانش کشید کرنا چاہے تو تصوف بلند ترین فلسفۂ حیات ہے۔ اگر کوئی اِس سے روحانی دنیا کی گرہ کھولنا چاہے تو یہ روحانیت کی معراج ہے۔۔ اور اِس کے ساتھ ساتھ تصوف اِن سب پہلوؤں سے عظیم و بلند ہے۔ یہ نور ہے۔ یہ زندگی ہے جو ہر روح کی روح ہے جو ہر فانی ہستی کو لافانی بنا سکتی ہے۔ تصوف محبت، ہم آہنگی اور توازن کا پیغام ہے۔ یہ خدائی پیغام ہے۔ یہ اِس دور اور ہر دور کا پیغام ہے۔ تصوف روح کی آواز پر لبیک کہنے کا نام ہے۔ یہ پیغام الفاظ اور کتب میں نہیں بلکہ نورِ خداوندی اور زندگی میں موجود ہے۔ نورِ خداوندی جو ہر روح کو خدائی طمانیت اور سکون سے ہم آہنگ کر رہا ہے۔

تصوف نہ الٰہیت ہے اور نہ ہی الحاد۔ کیونکہ الٰہیت کے نزدیک خدا خالقِ کائنات تو ہے ہادی نہیں ہے۔ اور الحاد خالصتاً انکار کا فلسفہ ہے اور انکار پر کسی فلسفۂ حیات کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ صوفی خدا پر یقین رکھتے ہیں۔۔۔ بلکہ صرف خدا پر ہی یقین رکھتے ہیں۔ لیکن کس خدا پر؟ وہ خدا جس سے وہ جدا کر دیے گئے ہیں۔ وہ خدا جو اُن کے اندر اور باہر موجود ہے۔ وہ خدا جس کے اندر ہم رہتے ہیں۔۔ حرکت کرتے ہیں اور زندگی پاتے ہیں۔ اُس ایک خدا کے ساتھ ایک ہونا صوفیا کی تعلیم ہے۔[3]

Marfat.com

باب 5

فلسفۂ تصوف

1۔ سائنس اور تصوف: مغربی اور مشرقی فکر

یہ بات میرے لئے ہمیشہ باعث تشویق رہی ہے کہ حضرت عنایت خانؒ اُس حقیقت تک کیسے پہنچ گئے جو جدید ترین سائنسی بصیرت سے ہم آہنگ ہے۔ موجودہ دور کی سائنس تجزیاتی طریقہ کار کی مدد سے آج اُن حقائق تک پہنچ رہی ہے جہاں تک حضرت عنایت خانؒ کی بصیرت تخلیقی تحریک، آمد اور کشف والہام کی مدد سے جا پہنچی تھی۔ صوفیا اور سائنس دان حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن دونوں کے طریقہ کار مختلف ہیں۔ سائنس گہرے تجزیے اور مشاہدے کو کام میں لاتی ہے جبکہ تصوف حقیقت میں تحلیل ہو کر داخلی و خارجی دنیاؤں کو اِس حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کا نام ہے۔

سائنس اور تصوف، مغربی اور مشرقی فکر، قرونِ وسطیٰ سے ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے۔ مغربی سائنس نے علتی جبریت کے نظریے کی روشنی میں حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ علتی جبریت (causal deterministic) کا نظریہ مذہبی اور صوفیانہ وژن کی ضد تھا۔ اس لئے مذہب اور سائنس کے درمیان سرد جنگ قرونِ وسطیٰ سے جاری تھی۔ لیکن آج ہم غیر معمولی دور میں رہ رہے ہیں۔ آج سائنس اور مذہب کے منحرفہ خطوط ایک بار پھر ایک دوسرے کو چھو رہے ہیں۔ آج کے بعض سائنس دانوں نے اپنی دریافتوں کو صوفیائے کرام کے وژن کے عین مطابق پایا ہے اور آج ہم سُن رہے ہیں کائنات منتشر اکائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ نامیاتی کُل ہے۔۔ غیر منقسم وحدت ہے۔ دورِ بعد از جدیدیت کی طبیعات

میں علیّت (علاقۂ علت و معلول) کی جگہ گمان اور احتمال نے لے لی ہے۔ کلاسیکل میکانیات کے مطابق کُل کا انحصار جزیات پر تھا جبکہ مقادیری میکانیات (quantum mechanics) کے مطابق جزیات کا انفرادی رویہ کُل کے افعال و رجحانات کے تابع ہے۔ اس بات کا اعلان 1930 میں معروف ماہر فلکیات و طبیعات دان سر جیمز جینز نے کیا تھا۔

> ''کائنات ایک عظیم فکر کی مانند ہے۔۔ اسے ہم ایک بہت بڑی مشین قرار نہیں دے سکتے''۔[1]

حضرت عنایت خانؒ کا صوفیانہ فلسفہ، جس کی جڑیں قدیم تصوف میں ملتی ہیں، کائنات کی موجودہ سائنسی تصویر سے مشابہت رکھتا ہے۔ مرکزِ واحد کی طرف کائنات کے اس میلان ۔۔ اس آفاقی استدقاق اور اجتماع کے کچھ پہلوؤں کی رمز کشائی ذیلی عنوانات کے تحت کی جائے گی:

2۔ ارتعاش:

سب سے پہلے حضرت عنایت خانؒ تمام تخلیق کو ارتعاش (vibration) قرار دیتے ہیں:

> ''عالمِ موجودات میں سب کچھ۔۔ جو کچھ ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔۔ ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ اگر ارتعاش کا عمل نہ ہوتا ایک قیمتی پتھر میں رنگ اور چمک دمک نہ ہوتی۔ یہ ارتعاش ہی ہے جو درختوں کو اگاتا ہے۔۔ پھلوں میں رس پیدا کرتا ہے اور کلیوں کو پھول بناتا ہے۔ ہمارا وجود بھی ارتعاش کے قانون کی فرمانبرداری کر رہا ہے۔ نہ صرف ہمارا طبیعی جسم بلکہ ہماری فکر اور احساسات بھی اِسی قانون کے پابند ہیں''۔[2]

یہ سب عہدِ عتیق کے مصری سریت پسندوں (Hermetics) کی روحانی دانش کے عین مطابق ہے۔ قدیم مصری سریت پسندوں کے تیسرے اصول کے مطابق ''کچھ بھی ساکن نہیں ہے۔ سب حرکت میں ہے۔ سب ارتعاش پیدا کرتا ہے''۔[3]

Marfat.com

ارتعاش کی کئی اقسام ہیں۔آج کی سائنس نے ارتعاش اور مرتعش اجسام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور چند حیران کن نتائج تک پہنچی ہے۔آج کی سائنس کائنات کے ذرے ذرے کو ترنم اور ہم آہنگی کے موسیقیائی اصولوں پر عمل پیرا دیکھ رہی ہے۔اور موجودہ سائنس نے اس اصول کو ''کروی موسیقی'' (music of spheres) کا نام دیا ہے۔[4]

یہ سمجھنا آسان ہے کہ آواز بھی ارتعاش کی ایک شکل ہے۔ہم وائلن کے تاروں کو مرتعش ہوتا دیکھ سکتے ہیں اور اِس سے پیدا ہونے والے مترنم اور غیر مترنم ارتعاش کو سن سکتے ہیں۔ طبیعات کی زبان میں آواز اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی معروض کے مالیکیول مرتعش ہوتے ہیں۔مرتعش اجسام کے سُروں کا انحصار ایک سیکنڈ میں ارتعاشات کی تعداد پر ہوتا ہے۔

اس طرح آواز ایک غیر مادی اور مجرد ''مظہر'' ہے۔اور روشنی ارتعاش کی ایک 'پُر اسرار حالت ہے۔طبیعات دان اِسے دو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔۔ایک صورت میں اسے توانائی سے بھرپور زرات (photons) کی گردش کے طور پر جانا جاتا ہے یا پھر اِسے لہر (wave) تصور کیا جاتا ہے۔روشنی کے مختلف رنگوں کا انحصار موجوں کے طول کی شدت پر ہوتا ہے۔یہ ایک حیران کن امر ہے کہ طول موج اور فریکونسی، جسے ہم روشنی کی رفتار کہہ سکتے ہیں، ہمیشہ 186,000 میل گھنٹہ ہوتی ہے۔

نظر آنے والی روشنی میں برقی و مقناطیسی لہروں کی ''تعداد'' غیر مرئی اور نا قابلِ دید روشنی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔قابلِ دید روشنی کی سب سے نچلی سطح پر انفرا ریڈ اور الٹرا وائلٹ شعاعیں ہیں۔اس کے بعد ریڈار اور ریڈیائی لہروں کی باری آتی ہے اور دوسری طرف ایکس ریز ہیں جن کی فریکونسی بہت زیادہ ہے۔

ہماری سوچ اور جذبات بھی غیر مرئی لہروں کی طرح نا قابلِ دید ہیں۔انسان آج تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کر سکا جس کی مدد سے اِن لہروں کی قدر پیمائی اور تجزیہ ممکن ہو۔تاہم نفسیات اور ماورائی نفسیات (Parapsychology) میں اِن کے اثرات کو جانا جا سکتا ہے۔ہمارے خیالات، افکار اور جذبات بھی ارتعاش اور اہتزاز کی مختلف ''اشکال'' ہیں اور ان کا ایک شخص سے دوسرے شخص تک انتقال ممکن ہے۔یہ لطیف ترین لہریں ہیں اسی لئے زمانی و مکانی فاصلے بھی اِن کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔روزمرہ زندگی میں ہمیں اِس بات کا تجربہ اُس وقت ہوتا ہے جب ہم کسی شخص کے موڈ سے اُس کے داخلی موسموں کا پتہ لگا لیتے ہیں۔اس صورت میں ہمیں

Marfat.com

الفاظ کا بھی محتاج نہیں ہونا پڑتا۔ خیال رسانی یا برون حسی ادراک (telepathy) اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ بعض خیالات ہزاروں میلوں کے جسمانی فاصلوں کے باوجود اُس ذہن تک پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں پہنچنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی قسم کے ایک اور معجزے کو ہم وقتگی (synchronicity) کہا جاسکتا ہے جس کے تحت ایک قسم کے خیالات دو مختلف مفکرین کے ذہنوں میں بیک وقت اترتے ہیں۔ دو ایسے مفکرین یا شعراء جن کے درمیان ہزاروں میلوں کی خلیج حائل ہوتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں ارتعاشِ لطیف کی رسائی لامکان کی سرحدوں تک ہے:

''ارتعاش واہتزاز کے حیطہ اختیار کا انحصار اُن کی لطافت پر ہے۔ ارتعاش جس حد تک لطیف ہوگا: اتنا ہی طاقتور ہوگا۔ اس کے علاوہ ارتعاش کی طاقت کا انحصار اُس کے نقطہ آغاز پر بھی ہے۔ نقطہ آغاز جس قدر لطیف، حساس اور مصفا ہوگا۔ اتنا ہی قوی ارتعاش پیدا کرے گا۔ بالفاظِ دیگر ہونٹوں سے ادا کئے گئے الفاظ صرف سننے والے تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ذہن سے ابھرنے والے خیالات کی رسائی دور تک ہے۔ طاقتور اور مصفا اذہان سے ابھرنے والے خیالات کی منزل قوی اور منزہ اذہان ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے الفاظ کا پیدا کردہ ارتعاش ذہن کے پیدا کردہ ارتعاش کی نسبت کمزور ہوتا ہے۔ ایک ایسے انسان کے جذبات، جس میں اُس کی نیک نیتی نے جوش اور توانائی پیدا کی ہو، دوسرے انسانوں کا دل چیر سکتے ہیں۔ جذبے خاموشی کی زبان بولتے ہیں لیکن الفاظ سے زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی شخص کی موجودگی اُس کی سوچ اور جذبات کا پتہ دیتی ہے۔ روح کا پیدا کردہ ارتعاش، سب سے لطیف ہونے کی وجہ سے، نہایت قوی اور دوررس ہوتا ہے۔ روحانی ارتعاشِ لطیف ایک روح سے دوسری روح تک روشنی سے بھی کئی گنا زیادہ رفتار سے پہنچتا ہے''۔[5]

آخر میں ہم مادہ کی ماہیت پر بات کرتے ہیں۔ مادہ ٹھوس ہونے کی وجہ سے مرتعش نہیں لگتا۔ تاہم علمِ طبیعات کے میدان میں مقادیری نظریے (quantum theory) کی رو سے

Marfat.com

مادہ لطیف ترین بنیادی ذرہ (particle) ہے یا پھر لہر (wave)۔ اس سطح پر مادہ ''ہونے'' کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ کاپرا کے مطابق:

''مقادیری میکانیات کے شعائر کے مطابق مادہ کے ''ہونے'' کا رجحان احتمال یا امکان کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ ہر سطح پر مخصوص مقداروں کے ساتھ منسلک رہتا ہے جو لہروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ لہریں اُن ریاضیاتی اشکال کی مانند ہیں جو گٹار کے تانت، صوت و آہنگ یا موجی طول کو ظاہر کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں''۔[6]

دراصل مادی جوہر کی شکل، جس میں مرکزے کے گرد الیکٹرانز بنیادی ذرات کے طور پر گردش کرتے ہیں، آج کل مستقل لہریں سمجھی جاتی ہیں جو اپنے مرکز کا مسلسل طواف کر رہی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ سائنس دان شروڈنجر الیکٹران کو ''ارتعاش کا قتلا یا قاش'' قرار دیتا ہے۔ اسی طرح گے مرشی ایک گھنٹی سے پیدا ہونے والے ارتعاش کا تقابل جوہری ارتعاش سے کرتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی طبیعات سب مظاہرات کو ارتعاش کا گونا گوں ظہور قرار دے رہی ہے۔ اس طرح کائنات کی بنیادی اکائی آلہ موسیقی کے تنے ہوئے تار یا تانت کی مانند ہے جس پر کوئی مشاق موسیقار مسلسل اپنی منڈلی چلا رہا ہے۔ کائنات کے مظاہراتی ستار کے یہ تنے ہوئے تار ایک پروٹان سے سو بلین گنا چھوٹے ہیں! تمام بنیادی قوتیں، فطرت کے تمام ذرات قدرت کے اس ستار کی باریک تاروں میں پیدا ہونے والے لطیف ارتعاش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔[7]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا مظاہراتی یا مادی پہلو گونا گوں ارتعاشات کی ہی ایک شکل ہے۔ قدرت کا تار بج رہا ہے اور تابکاری، صوت و آہنگ، افکار، جذبات اور رنگوں کے سُر پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ مادہ کو ارتعاشِ کثیف (dense vibration) کہتے ہیں۔ جبکہ، اُن کے نزدیک، غیر مادی اور غیر مرئی ''اجسام'' ارتعاشِ لطیف (finer vibration) ہیں۔ وہ ارتعاشات کے اس سلسلے کا بیان کچھ یوں کرتے ہیں:

''ارتعاش، اصولی طور پر، طول و عرض بھی رکھتا ہے۔ اور اُن کا دائرہ حیات ایک لمحے سے قلیل تر اور کائنات کے کھیل کے دورانیے سے

Marfat.com

طویل تر ہوسکتا ہے۔ اِن کے مختلف رنگ اور شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ایک اہتزاز دوسرے کو جنم دیتا ہے۔ اور اس طرح وحدت سے کثرت جنم پذیر ہوتی ہے۔ یہاں ایک دائرے کے اوپر دوسرا دائرہ ہے اور ان دائروں کے لامتناہی سلسلے سے کسی نے کائنات کی مہین چادر بُن دی ہے‘‘۔[8]

3۔روح اور مادہ:

مندرجہ بالا گفتگو کے بعد ہم اِس سوال کی طرف آتے ہیں کہ روح (spirit) کیا ہے؟ مادی دنیا کے برعکس کائنات میں ارتعاشِ لطیف بھی وجود رکھتا ہے جس میں آواز اور فکر بھی شامل ہیں۔ روح اور مادہ (matter) شروع سے ایک دوسرے کی ضد مانے گئے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ ان اضداد کو بہت واضح طور پر بیان کرتے ہیں:

’’زندگی دو طرح کی ہے۔ ان دو میں سے ایک کو تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ دوسری کو نہیں۔ زندگی کی تسلیم شدہ شکل وہ ہے جسے ہم مادی دنیا کہتے ہیں۔ اور زندگی کی جس حالت کو تسلیم نہیں کیا جارہا ہے اُسے ہم خلا یا جوف (vacuum) کہہ سکتے ہیں‘‘۔[9]

عصر حاضر میں سائنس نے ویکیوم کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ جو کچھ کل بے جان مادہ لگ رہا تھا آج ایٹمز کا مجموعہ کہا جارہا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے الیکٹرانز اپنے محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ الیکٹرانز کی حرکت خلا میں وقوع پذیر ہوتی ہے کیونکہ انہیں حرکت کرنے کے لئے جگہ چاہیے۔ اس لئے ایک جوہر کا اہم ترین اور بڑا حصہ خلا ہی ہے۔

لیکن یہ خالی پن۔۔۔ یہ جوف کیا ہے؟ ہم اپنے حساس ترین آلات کی مدد سے بھی اس سوال کا جواب تلاش نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمارے لطیف اور حساس ترین آلات بھی جوہر کے اندر موجود اس خلا کو نہیں دیکھ پاتے اس لئے سائنس دانوں نے اسے لاموجود، عدم یا لاشے (nothing) کہا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کی صوفیانہ زقند اس بحر بیکراں کو ایک جست میں عبور کرلیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

’’درحقیقت یہ لاموجود۔۔۔ عدم اور لاشے ہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ ہستی کے ان لطیف ترین سرچشموں سے پھوٹ رہا ہے‘‘۔[10]

Marfat.com

سائنس دانوں کے لئے مشکل یہ ہے کہ وہ اُن حساس ترین آلات سے ویکیوم کا مشاہدہ نہیں کر سکتے جن کی مدد سے ہم مادی کائنات یا اس کے بنیادی ذرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ اسی ویکیوم۔۔اسی خلا کو ہی روح کہتے ہیں۔اُن کے بقول ''روح ارتعاشِ کثیف (مادہ) کی عدم موجودگی کا نام ہے۔جو کچھ مادے سے ماورا ہے روح ہے۔۔شعور ہے''۔ یہ روح، یہ مادہ، یہ شعور وہی کچھ ہے جس کے حاصل جمع کو پیغمبروں،صوفیوں اور سنتوں نے روحِ کُل یا خدا کہا ہے۔۔جس میں ہم سانس لیتے ہیں،حرکت کرتے ہیں اور اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کائنات میں نہیں رہتا بلکہ کائنات اُس میں رہتی ہے۔

مادہ اور روح کے فرق کو واضح کرنے کے بعد حضرت عنایت خانؒ اِن دو تصورات کو ایک بار پھر ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔وہ اس انضمام اور ہم آہنگی کو مندرجہ ذیل مثال سے واضح کرتے ہیں:

> ''جس طرح برف اور پانی دو مختلف اشیا ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ بالکل اسی طرح مادہ اور روح بظاہر مختلف سہی لیکن حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔پانی مخصوص حالات میں کچھ دیر بعد برف میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب برف پگھلتی ہے تو یہ ایک بار پھر پانی بن جاتی ہے''۔[11]

حقیقت میں مادہ روح سے جنم لیتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد خلا ہے۔اس لئے مادے کی حقیقت روح ہے۔مادہ روح کا وہ عمل ہے جو کثافت میں ڈھل کر دائرۂ حواس میں داخل ہو گیا ہے۔اب ہم قوتِ مدرکہ کی مدد سے اُس کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔مادہ حجاب ہے اور اس حجاب میں روح محجوب ہے۔[12]

اسی کتاب میں آگے چل کر حضرت عنایت خانؒ جوہرِ حقیقی (substance) اور خلا پر بات کرتے ہیں:

> ''جوہرِ حقیقی جوہر کے بطن البطون یعنی خلا میں وجود رکھتا ہے۔یہ خلا میں جنم لیتا ہے اور اسی کے اندر پروان چڑھتا ہے۔خلا ہی میں اس کی تعمیر ہوئی ہے اور ایک دن اسی جوہری خلا میں ہی یہ تحلیل ہو جائے گا۔یہی انا للہ وانا الیہ راجعون کی صدر کشائی ہے''۔[13]

روح ارتعاش کے عمل کی وجہ سے مادی شکل پاتی ہے۔ عملِ ارتعاش کی مدد سے سب سے پہلے قابلِ سماعت، پھر قابل دید اور آخر میں دائرۂ حواس میں داخل ہو کر ممکن المس ہو جاتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اس پر کہتے ہیں:

''سب سے پہلے اسمِ اعظم (The Word) تھا۔۔اور یہی اِسم خدا تھا''۔

اس کے بعد وہ اُن تمام مراحل کی رمز کشائی کرتے ہیں روح جن سے گذر کر مادی روپ دھارتی ہے:

''غیر مرئی ارتعاش سب سے پہلے جوہر بنتا ہے۔ جوہر سے زندگی جنم لیتی ہے اور زندہ اجسام وجود میں آتے ہیں۔ جونہی سانس کا عمل جاری ہوتا ہے جسم کو شعور عطا ہو جاتا ہے''۔[14]

حضرت عنایت خانؒ کے افکار ایک بار پھر عصر حاضر کی سائنس کی تائید کر رہے ہیں۔ الیف کاپرا (F. Capra) نے اپنی معروف کتاب The Tao of Physics میں واضح طور پر لکھا ہے:

''بنیادی ذرات، جن سے مادی کائنات بنی ہے، اور خلا کے درمیان متحرک رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ خلا دراصل ایک نامیاتی جوف ہے۔ جس کی نبض چل رہی ہے اور تعمیر و تخریب کا ساز ازل سے بج رہا ہے۔ خلا کی متحرک خصوصیات کی دریافت علمِ طبیعات کی اہم ترین دریافتوں میں ایک ہے۔ اس سے قبل ہم خلا کو محتوی کے طور پر جانتے تھے جس میں مادی مظاہرات ''رکھے'' ہوئے ہیں۔ لیکن آج اس کی متحرک خصوصیات کے سامنے آنے کے بعد اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ عصرِ حاضر کی طبیعات کے نتائج عہدِ عتیق کے چینی حکیم شانگ سائی کی دانش کی تصدیق کر رہے ہیں:

''جب انسان جان لیتا ہے کہ عظیم خلا وفورِ حیات (Ch'i) سے بھرپور ہے: وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ نیستی واہمہ ہے۔۔سب ہستی ہے''۔[15]

ابھی ایک سوال کا جواب باقی ہے۔ یہ روح کیا ہے جسے ارتعاش مادے میں بدل دیتا ہے۔۔ جو پہلے قابلِ سماعت اور پھر محسوس باللمس ہو کر دائرۂ حواس میں داخل ہو جاتی ہے۔

حضرت عنایت خانؒ کہتے ہیں کہ روح انسانی تصورات سے ماورا ہے۔ لیکن ہم اسے ''فہمِ خالص'' (pure intelligence) کہہ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں فہم سے مراد قوتِ فکر نہیں ہے۔ یہ تصور جاننے کی عمومی خاصیت سے عظیم و بلند ہے۔ آخر میں وہ یہ فارمولا واضح کرتے ہیں، ''جب شعور صرف یہ جانتا ہے کہ وہ شعور ہے تو اس ''جانکاری'' کو ہم فہمِ خالص کہیں گے''۔ اس رمز کی تعبیر سے ہی زندگی کا راز جانا جا سکتا ہے۔[16]

روح (spirit) تمام مخلوق میں اور تمام مخلوق کے ذریعے مصروفِ عمل ہے۔ انسان کے اندر کام کرنے والی اس قسم کی توانائی کو روح (soul) کہتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ انسان کے اندر اس خالص توانائی کو آفتابِ خداوندی کی کرن کہتے ہیں۔ ایک سطح پر یہ کرنیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں لیکن اِن سب کا سرچشمہ ایک ہی سورج ہے۔

اس مثال سے ہم خدا کی تمام مخلوق کی وحدت کا راز جان سکتے ہیں۔ یہی وحدت آج سائنس کے وژن میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ اس لئے ڈیوڈ بوہم کائنات کے لیے ''غیر شکستہ کُل'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور کاپرا عصرِ حاضر کی سائنس کا وژن بیان کرتے ہوئے کائنات کو ''ایک ناقابلِ تقسیم متحرک کُل'' کہتے ہیں جس کا ہر جزو ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور اسے کائنات کا مکمل علم پائے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔[17] کاپرا لکھتا ہے:

> ''جیسے جیسے ہم مادے کو جاننے کے لئے حساس سے حساس ترین آلات استعمال کرتے ہیں، ہمیں ایک دوسرے سے جدا اور خود مکتفی بنیادی ذرات نہیں ملتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کائنات نامیاتی کُل ہے۔۔ ایک سانس لیتا ہوا جسم ہے''۔[18]

یہ حقیقت اُس وقت کھلتی ہے جب ہم ایٹم کا تجزیہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایٹم کا وجود جن بنیادی ذرات یا لہروں پر منحصر ہے انہیں ٹکڑوں میں نہیں جانا جا سکتا۔ ہم اُن کے باہمی تعلق کو جانے بغیر کائنات کی ماہیت سے واقف نہیں ہو سکتے۔[19]

حضرت عنایت خانؒ اسے ''فطرت کا سہ فرعی پہلو'' (threefold aspect of nature) کہتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں پیرومرشد کی وجدانی زقند اس بار کائنات کے کس راز سے پردہ اٹھا رہی ہے:

Marfat.com

''فطرت کے اِن تین پہلوؤں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تین پہلو ہر شے، ہر حالت اور ہر ہستی میں موجود ہیں۔ان کے بغیر کوئی بھی شے وجود نہیں رکھ سکتی۔تاہم صرف مشاہدہ کرنے کے دوران یہ تین دکھائی دیتے ہیں۔اگر ہم ان پہلوؤں کو تین ہی سمجھتے رہیں تو ہم چُوک گئے ہیں۔لیکن اگر ہم یہ جان گئے کہ یہ تین نہیں ایک ہیں تو مزید جاننے کے لئے کچھ نہیں بچتا''۔[20]

حضرت عنایت خانؒ فطرت کے اس سہ فرعی پہلو کو انسانی اور مذہبی پس منظر میں بھی بیان کرتے ہیں۔مثال کے طور پر عشق کے عالمگیر جذبے کے تین پہلو عاشق، معشوق اور عشق ہیں۔اس طرح علم کے بھی تین پہلو ہیں۔عالم، معلوم اور علم۔دنیا کے قدیم ترین مذہب ہندومت میں تری موتری کا تصور موجود ہے جس میں برہما (خالق)، وشنو (پالنے والا، رب) اور وشنو فنا یا تحلیل کرنے والی قوت کا نام ہے۔دینِ عیسوی میں یہ تصور باپ، بیٹے اور مقدس روح کی صورت میں موجود ہے۔

لیکن حضرت عنایت خانؒ اِس سہ فرعی حقیقت کو تخلیق کا مغز قرار دیتے ہیں۔ایک ایٹم کے مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ایٹم مرکزے اور الیکٹرانز کی ثابت وقائم پیوندکاری کا نام ہے۔اور فطرت نے اسی سے ہستی ومظاہرات کا تانا بانا بنا ہے۔اس کے علاوہ مالیکیولز فطرت کی اسی شیشہ گری کا علم بہم پہنچاتے ہیں اور ہمیں خود انحصاری اور باہمی انحصار کے توازن کا پتہ دیتے ہیں۔یہاں تک کہ گے مرشی ہمیں آکسیجن میں بنیادی جنسی رجحان کی خبر دیتے ہیں۔اُن کے نزدیک آکسیجن میں دیگر عناصر کے ساتھ ایک ہونے کا قوی رجحان موجود ہے۔[21]

اس طرح ہم کائنات کے ذرے ذرے میں، لہر لہر میں ''ایک ہونے'' کا رجحان پاتے ہیں۔اور اسی سے ہم ڈیوڈ بوہم کی طرح اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات منتشر اور خود مکتفی جزیات کا نام نہیں بلکہ یہ ''نا شکستہ کُل'' ہے۔ڈیوڈ بوہم لکھتے ہیں:

''دنیا جس میں ہر چیز ایک دوسرے سے جدا نظر آتی ہے دراصل ایک نامیاتی جسم کی مانند ہے جس میں ہر وہ شے جو جدا نظر آتی ہے ایک ہے۔

کائنات اور مظاہرات ایک وحدت کا نام ہیں۔ کائنات کا مطالعہ ہمیں بار بار اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ مظاہرات کے پردے میں ایک عظیم تخلیقی قوت کارفرما ہے"۔[22]

حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں کہ کائنات روحِ عظیم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ وہ ایک عظیم ہستی، ہستی کے ہر پرت میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا کائنات کا ہر ذرہ۔۔ ہر جوہر اپنے اندر تخلیقی فراست (روح) رکھتا ہے تو انہوں نے جواب دیا:

"بلاشبہ۔۔ کیونکہ ظہور کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس لئے اس کائنات کا ہر بنیادی جزو (مادی اور غیر مادی) اپنی حقیقت سے غیر متعلق ہو کر باقی نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ باقی ہے۔۔ جو کچھ باقی رہے گا۔۔ وہ اُس سے منسلک ہوگا جو قائم و ثابت ہستی ہے۔ حتیٰ کہ گرد و غبار بھی اگر اُس نورِ ازلی کی جھلک سے منور نہ ہوتا تو یہ روشنی منعکس نہ کر پاتا اور ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔ ہم اِسے اِس لئے دیکھتے ہیں کہ یہ روشنی منعکس کرتا ہے۔ یہ اِس کی اپنی روشنی ہے جو اِسے ہماری بصارت پر ظاہر کرتی ہے۔ روشنی کی حقیقت نورِ ازلی ہے اور یہی ہستی کا سرچشمہ ہے۔

کوئی مقام خدا سے خالی نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ برابر موجود ہے۔ کوئی جگہ اُس تخلیقی ذہانت سے خالی نہیں ہے۔ جو مقام بھی اس سے خالی نظر آتا ہے۔۔ دراصل خالی نہیں ہوتا۔۔ ہماری کور چشمی کے طفیل خالی نظر آتا ہے۔ وہ تخلیقی ذہانت جس شے میں بھی مستور ہے ایک دن ضرور ظاہر ہوگی۔ حیات اور رنگ و بو کا یہ سلسلہ اُس عظیم ترین حقیقت کی بتدریج رمز کشائی کا ایک کھیل ہے اور یہی سلسلہ ارتقا ہے۔ وہ قوت پیہم آرائشِ جمال میں محو ہے اُس کے حُسن سے ہر مظاہراتی پیمانہ چھلک رہا ہے۔ یہ طاقت عظیم قدرتی مظاہرات میں اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ سیلابوں میں، بجلی کی گرج چمک میں، ستاروں میں اور سیاروں کی گردش میں وہی منتظر حقیقت لباسِ مجاز زیب تن کرتی نظر آتی ہے۔ یہ حقیقتِ مستور آشکار

Marfat.com

ہونا چاہتی ہے اور اِس کا ذریعہ انسان ہے۔ اس لئے انسان ہی کائنات کا سب سے بڑا راز ہے جو ہبوطِ آدم کے "سانحے" پر فاش کر دیا گیا۔ اس لئے روحانیت انسانی ارتقا اور تکمیل کا ذریعہ ہے"۔

سوال: کیا مادے کی روحانی تعبیر سے یہی کچھ مراد ہے؟

جواب: بلاشبہ۔۔۔ مادے کی روحانی تعبیر یہی ہے۔[23]

4۔ سلسلۂ تخلیق:

جب وحدتِ تخلیق کا راز ہم پر آشکار ہونے لگے تو ہم اس کا ماخذ بھی جان سکتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی سائنس کی تمام تر توجہ اِس وقت سلسلۂ تخلیق کے انتہائی نقطۂ آغاز (زیرو پوائنٹ) یا انفجارِ عظیم (Big Bang) پر مرکوز ہے اور کائنات کی ابتدا کو جاننے کے لئے کئی مفروضات منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ تاہم یہ مقام انسانی سرحدِ ادراک سے پرے ہے۔ اسی نقطے پر انسانی فکر اُس دنیا میں داخل ہوتی ہے جہاں بھید اور اسرار کی دھند کے علاوہ اُسے کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ اس لئے یہ مقام ماورائے کلام اور ماورائے علوم ہے۔ اور اسی لئے سلسلۂ تخلیق کے متعلق مفروضات دقیق اور پُر اسرار ہیں۔

حضرت عنایت خانؒ سلسلۂ تخلیق کو صوفیانہ اور مذہبی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور کتاب The Soul, Whence & Whither میں لکھتے ہیں:

"اس تجلی۔۔۔ اس اظہار سے قبل کیا تھا؟

ذات! جوہرِ ہستی۔۔۔ رُب الحیات۔۔۔ واحد ہستی جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔

کس شکل میں؟ کس حالت میں؟

لاشے (nothing) کے طور پر۔ ہم اُسے بے نسبت، غیر موصوف، واجب الوجود اور قائم بالوصل ہستی کہہ سکتے ہیں۔

صوفیا نے اُسے موجودِ حقیقی (احدیۃ) کہا ہے۔

اس بے نسبت اور واجب الوجود ہستی سے شعور نے جنم لیا جسے شعورِ ہستی کہا گیا ہے۔ واجب الوجود کسی اور وجود کا شعور نہیں رکھ سکتا تھا۔۔۔ کیونکہ اُس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ذات کی اس سطح کو وحدت کہتے ہیں۔

Marfat.com

وحدت سے مراد ''صوتی شعور'' بھی ہے۔ جبکہ ذات، واجب الوجود اور خاموش ہے۔۔قائم وثابت ہے۔۔غیر مادی اور غیر مرئی ہے اس لئے پہلا ارتعاش آواز کو جنم دیتا ہے۔اور اس کے بعد:

''اس سے ہستی کے شعور میں ''ہونے'' کا احساس جنم لیتا ہے۔۔یہ شعور کہ ''میں ہوں''۔ یہ شعورِ ہستی کا ارتقاء ہے۔اس ارتقاء سے نفسِ واحدہ یا کلمہ الٰہی (Logos) جنم لیتا ہے جسے تصوف کی زبان میں وحدانیت کہتے ہیں۔شعورِ ذات، جو واجب الوجود کی خلقی طاقت ہے، ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔اس کے بعد نورِ ازلی اسی نقطے پر مرکوز ہو کر شعورِ ذات کا مرکزہ بنتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اس نورِ ازلی کو ہی ''روح عالم'' کہتے ہیں''۔

اس نورانی مرکزے کو ہم سورج سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔حضرت عنایت خانؒ اس امر کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

> '' نور حقیقت کا وہ پہلو جس کے ذریعے خدا ہستی کو عیاں اور آشکار کرتا ہے۔ اِس تجلی اور ظہور کا پہلا قدم تحدید اور اختصار ہے۔ یہ انقباض اور تخفیف تمام زندہ چیزوں میں نظر آتی ہے۔فروبستگی اور تخفیف کے بعد کشادگی اور توسیع کا مرحلہ آتا ہے جو دراصل گذشتہ اختصار و انقباض کا ردِ عمل ہے۔ گذشتہ رجحان عملِ استنشاق یا سانس کے اندر کھینچے سے مترادف ہے۔اور موخر الذکر رجحان دم برآوری یا سانس باہر نکالنے کا عمل ہے۔زندگی کے ہر پہلو میں اختصار و تخفیف اور بسط و کشاد خدا کی طرف سے ہے۔''

نورِ ازلی کی ہمہ جائیت اس رجحان کے توسط سے مرتکز ہو جاتی ہے اور اسی مرتکز روشنی کو صوفیا نے شمس کہا ہے۔شاہ شمس تبریزؒ اس کا ذکر اپنے ایک شعر میں کرتے ہیں:

> '' جب اُس کے چہرے کا شمس تجلی فرماتا ہے۔۔ دونوں جہانوں کے جواہر جگمگانے لگتے ہیں۔اُس کی روشنی کے ہر جوہر پر پڑنے سے ہی اُسے نام اور شکل عطا ہوتی ہے''۔[27]

اس طرح سلسلۂ تخلیق کا یہ مرحلہ روحانی روشنی سے عبارت ہے۔اس نور کی توسیع، جو اوّلین انقباض اور تخفیف کا قدرتی نتیجہ ہے، تمام تجلی اور مظاہراتی ظہور کی بنیاد ہے۔[28]

Marfat.com

تجلی وظہور کے اس سلسلے کا خلاصہ حضرت عنایت خانؒ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

''مرکزی نور نے اس کے بعد زندگی کو دو روپ دیئے: روشنی اور تاریکی۔ دراصل تاریکی کا وجود واہمہ کی پیداوار ہے۔ کامل تاریکی وجود ہی نہیں رکھتی۔ روشنی کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ کم روشنی کو ہی ہم تاریکی کہتے ہیں۔ روشنی اور تاریکی کے اس کھیل سے آکاش وجود میں آتا ہے جسے تصوف کی زبان میں آسمان کہتے ہیں جو نورِ ازلی کی رہائش گاہ کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آسمانوں کے درجات کے استعارے بھی صوفیائے کرام کے ہاں ملتے ہیں۔۔ آسمانوں کا اعداد و شمار روح کے مادے میں ڈھلنے کے مراحل کا استعاراتی وعلامتی بیان ہے۔ روح قانونِ ارتعاش کی مدد سے مادی روپ اختیار کرتی ہے اور قانونِ ارتعاش ہی حرکت کو جنم دیتا ہے۔ جس سطح پر ارواح مختلف اشکال میں ظہور پذیر ہوتی ہیں اُس سطح کو تصوف کی اصطلاح میں عالمِ اجسام کہتے ہیں۔

اِن اشکال سے رفتہ رفتہ معدنیات وجود میں آئیں اور اس کے نباتات کا ظہور ہوا۔ نباتات کے بعد حیوانات وجود میں آئے اور حیوانی دنیا کا نقطۂ عروج انسان ہے۔ اس طرح روحِ اعظم کو اجسام عطا ہوئے۔ اِسے اجسام کی ضرورت اُس وقت ہوئی جب اِس نے اپنے آپ کو ایک نقطے پر مرتکز کرلیا۔ اس مقام پر نورِ ازلی سے شعاعیں نکلیں اور روحِ ازلی کو انسان میں انفرادیت نصیب ہوئی''۔[29]

''مادی مظاہرات خدائی دم برآوری (سانس باہر نکالنا) کا نتیجہ ہیں۔ اور دنیا کا خاتمہ انجذاب کا عمل ہے جسے ہم استنشاقی عمل (سانس اندر کھینچنا) بھی کہہ سکتے ہیں۔[30]

حضرت عنایت خانؒ کا سلسلۂ تخلیق اور انجذاب کے بارے میں یہ بیان اُس فلکیاتی مفروضے سے ملتا ہے جسے ''نظریۂ انقباضِ عظیم'' (Big Squeeze Theory) کہا جارہا ہے۔ انفجارِ عظیم (big bang) کے نتیجے میں اجرامِ فلکی پھیل رہے ہیں۔ جس دن اس بڑے دھماکے کا زور ٹوٹے گا تو اجرامِ فلکی ایک بار پھر اپنے مرکز کی جانب رجوع کریں گے۔ اس مراجعت کو انقباضِ عظیم کہا جارہا ہے اور حضرت عنایت خانؒ کا روحانی نظریہ اس نظریے سے

Marfat.com

ملتا جلتا ہے جس کی روشنی میں سائنس تخلیقِ کائنات کا معمہ حل کر رہی ہے:

''یہ سانس لیتی ہوئی۔۔پھیلتی ہوئی کائنات کشادگی کے عمل سے گذرنے کے بعد سکڑ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسانی پھیپھڑے عملِ تنفس کے دوران پھیلتے اور سکڑتے ہیں۔ہم ایک غلو آمیز اور اِغراقی نوعیت کی کائنات کا حصہ ہیں جس کی وسعتیں حدود کی منکر ہیں۔ اور، اگر ہم ریاضیاتی ضروریات کو مدِ نظر رکھیں، یہ کائنات ایک دن سکڑ کر تحدید اور اختصار کی حدود سے تجاوز کر جائے گی۔ابدیت سے ایک قدم اُدھر رکھیں تو یہ حدود فراموش ہے۔۔ایک قدم اِدھر اٹھائیں تو ایک جوہر۔۔ ایک ذرۂ بے نیابت۔ بہر حال یہ دو انتہائیں تناسب اور توازن کی آئینہ دار ہیں۔۔ایک طرف سقوطِ قُمقمہ۔۔دوسری طرف انفجارِ عظیم۔ایک طرف تلفیف اور الجھاؤ۔۔دوسری طرف ارتقاء تزئین اور سلجھاؤ۔۔ایک توازن جو کسی دُم دار ستارے کی آمد اور اس کے بتدریج غائب ہونے کے عمل کے مترادف ہے۔ اور یہی توازن وقت کی تفہیم اور ادراک کے دروازے کھول رہا ہے''۔[31]

باب 6

عالمِ ملکوت سے عالمِ ناسُوت تک

(نزول اور رجعت)

گذشتہ باب میں ہم نے تخلیق کے پرُشکوہ سلسلے پر بات کی اور اب تک یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ تخلیق کے ہر مرحلے پر روح اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ انسانی روح (spirit) کو ''soul'' کہتے ہیں جو خورشیدِ خداوندی کی کرن ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اپنے لیکچرز کی مشہور سیریز The Soul, Whence & Whither میں عظیم ترین تخلیقی مراحل کی ارتقائی منازل کی بھرپور منظر کشی کرتے ہیں جو صرف ذاتی تمکین کے باعث ہی پرشکوہ اور پرشوکت معلوم نہیں ہوتی ہے بلکہ عصرِ حاضر کی سائنسی دریافتوں سے بھی مماثل ہے۔

روح کے اس نزولی ورجعی سفر کے دوران حضرت عنایت خانؒ ہبوطِ آدم اور مراجعت کی تمثیل کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ روح الوہی سرچشموں سے پیکرِ خاکی میں ملبوس ہونے تک کن مراحل سے گذرتی ہے اور پھر کس طرح اپنی حقیقت کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کا وژن وضاحت اور پُراعتمادی میں مصفا اور لاثانی ہے۔ اُن کی وضاحتیں بے جا الفاظ آرائی سے پاک اور حیران کن حد تک واضح ہیں۔ اِن وضاحتوں کے دوران وہ خدا، ملکوتی وانسانی حیات کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں جیسے وہ کسی واقعے کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہے ہوں۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حضرت عنایت خانؒ نے وہ سب دیکھا ہے جو وہ بیان کرر ہے ہیں۔ اُن کی صاف اور نتھری ہوئی وضاحتیں، مولانا جلال الدین رومیؒ کے الفاظ میں، ''خبر'' کا نہیں ''نظر'' کا بیان ہیں۔ وہ سب کچھ جو ہمارے لئے غائب ہے ایک صاحبِ نظر کے

Marfat.com

لئے حاضر ہے۔ خدا کا ایک بندہ وہ کچھ کیسے جان لیتا ہے جو ہم نہیں جان پاتے؟ وہ کچھ کیسے سُن لیتا ہے جو ہمیں سنائی نہیں دیتا؟۔ وہ کچھ کیسے محسوس کر لیتا ہے جو ہمارے دائرۂ حواس سے باہر ہے؟

حضرت عنایت خانؒ سے کسی نے پوچھا:

''اولیائے کرام نے ''خبر'' کی ضرورت پر نہیں ''نظر'' کی ضرورت پر زور دیا ہے۔۔ ہمیں یہ بتائیں ایک ولیِ کامل باطنی، خارجی اور الوہی دنیا پر بیک وقت کیسے نظر رکھتا ہے؟''

حضرت عنایت خانؒ نے جواب دیا:

''سب سے پہلے پیغمبرانہ واردات کو سمجھ لیں۔ پیغمبر کی روح ایک ایسے پھل دار درخت کی مانند ہے جس کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھک کر زمین کو چھو رہی ہیں۔ اور یہ شاخیں ہستی کے ہر درجے۔۔ ہر مرحلے سے ہوتی ہوئی زمین تک پہنچی ہیں۔ اِس لئے پیغمبر تخلیق اور ہستی کے ہر مرحلے پر موجود ہے اور زمین پر بسنے والوں کو دعوتِ نظر دے رہا ہے۔ پیغمبرانہ شعور کا یہی راز ہے۔۔ پیغمبر ہستی کی ہر سطح پر بیک وقت موجود ہے اور جو کچھ اُس نے خود دیکھ لیا ہے۔۔ دوسروں کو دکھانے کے لئے تڑپ اٹھا ہے۔ پیغمبر زمین کے لوگوں کو آسمان کی خبریں نہیں سناتا۔۔ بلکہ انہیں اتنا بلند کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

ولیِ کامل کی کیفیت کچھ حد تک ایسی ہی ہے اگر وہ پیغمبرانہ شعور میں انفرادی شعور فنا کر لیتا ہے۔ اِس کے بعد اُس کے پھل کا رشتہ جڑوں سے بھی مضبوط ہے اور اُس کی شاخیں لامکان کی حدود سے بھی بوس و کنار میں مصروف ہیں۔۔ بہت سے لوگ خدا کا نام لیتے ہیں اور اُن کے نزدیک خدا ایک تصور ہے۔۔ لیکن پیغمبروں اور اولیائے کامل کے نزدیک صرف خدا ہی حقیقت ہے''۔ 2

حضرت عنایت خانؒ مزید فرماتے ہیں:

''خدا کے ہر پیغمبر نے اپنے پیروکاروں کو عالمِ بالا کے بارے میں بتانے کے لئے وہی انداز اختیار کیا ہے جسے اُن کے پیروکار سمجھ سکتے تھے۔ اس

Marfat.com

لئے جزاوسزا کے قدرتی نظام کی تفہیم کے لئے جنت اور جہنم کے تمثیلی بیانات کا سہارا لیا گیا تا کہ عام اذہان کو اچھائی پر آمادہ کیا جا سکے"۔

حضرت عنایت خانؒ کی سلسلۂ تخلیق کے تناظر میں نکتہ سنج وضاحتیں اور لطیف تشریحات اُن کی ذاتی روحانی واردات اور فلسفیانہ بصیرت کا ثمر ہیں۔ یہ بات عام مغربی اذہان کے لئے حیران کن ہے کہ اُن کی کشفی بصیرت اور عصرِ حاضر کی سائنس ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اس طرح حضرت عنایت خانؒ نے عشق والہام کی مدد سے ایسے حقائق فاش کئے ہیں جن تک دورِ حاضر کی سائنس لطیف آلات کی مدد کے بغیر نہیں پہنچ سکتی۔

1۔ ملکوتی دنیا:

خداوندِ کریم روح کائنات ہے۔ یہ ذات ہستی کا جہاں تاب سورج ہے اور ہم سب اس کی کرنیں ہیں۔ ہمارا باطن اُسی کی کرنوں سے جگمگا رہا ہے۔ تاہم ملائکہ نورِ ازلی سے قریب تر حیات کر رہے ہیں۔۔ ان فرشتوں کی دنیا کو ملکوتی دنیا کہا گیا ہے۔ کچھ روحیں اس انداز میں حیات کر رہی ہیں جبکہ دوسری، جن کے اندر الوہی توانائی زیادہ ہے، حیات کی اس سطح سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

ہم اکثر یہ سوال کرتے ہیں۔۔ کیا فرشتوں کی کوئی شکل ہے؟ حضرت عنایت خانؒ کہتے ہیں کہ اس حقیقت کا الفاظ میں بیان ممکن نہیں۔ تاہم وہ فرماتے ہیں:

> "ہر وہ چیز جس کا کوئی نام ہے کوئی نہ کوئی شکل ضرور رکھتی ہے۔ لیکن ہم انسان جسے دیکھ سکتے ہیں صرف اُسی کی شکل کا تصور کر سکتے ہیں۔ اور جسے ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔۔ اُس کی شکل کا تصور بھی محال ہے۔ اس لئے فرشتوں کی شکل کا ادراک پانے کے لئے ہمیں بھی فرشتہ ہونا پڑے گا۔۔ تا کہ ہم جان سکیں کہ فرشتہ کیا ہے۔ ہم انسان اس چیز کے عادی ہیں کہ ہم ہر اَن دیکھی چیز کا انسانی تصور ہی قائم کرتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی بھی ہم پریوں، فرشتوں، روحوں اور بھوتوں کی ذہنی تصویر کشی کرتے ہیں تو انہیں انسان کا روپ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ صرف خدا کو بشری پیکر عطا کرنے کی غلطی کرتا ہے۔۔ اُس پر اپنے جذبات اور تعصبات ٹانکنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ہر غیر مرئی مخلوق کے لئے پیکرِ بشری

Marfat.com

کو ہی سب سے مناسب سمجھتا ہے۔ چین کے مصور جب بھی پریوں کی تصویر بناتے ہیں ۔۔ اُن کی بنائی ہوئی پریوں کے خدوخال چینی ہی ہوتے ہیں۔ اور روسی پریاں روسی ہیٹ پہنے بغیر کینوس پر ابھرنے سے انکار کردیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن میں صرف وہی تصور اٹک جاتا ہے جس کا وہ عادی ہوتا ہے''۔[3]

حقیقت میں ملائکہ نورانی مخلوق ہیں۔ وہ ارتعاش ہیں۔ وہ خدا کے قریب تر ہیں۔ اُن کی ہستی جذبات اور اشتعال سے پاک ہے۔[4] ہستی کے اس درجے پر مقیم ارواح زمینی تفاوت اور تفریق سے ماورا و بلند ہیں۔ فرشتے صرف خوشی کے احساس سے واقف ہیں ۔۔ اور خوشی ہی روح کی حقیقی فطرت ہے۔ محبت ملائکہ کی فطرت ہے اور وہ یقین کرنے کے لئے ہردم تیار ہیں۔ کچھ مصوروں، قوتِ متخیلہ کی مدد سے، فرشتوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ انہوں نے فرشتوں کو بادلوں پر بیٹھے ہوئے موسیقی بجاتے دکھایا ہے۔ موسیقی ایک علامت ہے۔ دراصل مصور یہ بتانے کی کوشش کررہا ہے کہ فرشتہ زندہ ارتعاش کا نام ہے۔ انہیں بادلوں پر بیٹھا دکھا کر مصور یہ بتانے کی کوشش کررہے تھے کہ فرشتے دنیا کے عارضی لطف اور تکلیف سے ماورا ہیں۔

''ایسی روحیں جو خدا سے قریب تر ہیں اور عارضی دنیا کا علم نہیں رکھتیں، جو موت سے واقف نہیں ہیں، وہ دائمی خوشی میں حیات کررہی ہیں اور خدائی نور ہی اُن کی غذا ہے۔ ایسی روحیں کا نورِ ازلی میں قیام پذیر ہیں اور یہی بلند ترین مقام (عرشِ معلیٰ) کا استعارہ ہے۔[5]

ملائکہ کی خوشی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ یہ ہروقت نورِ الٰہی میں بھیگے رہتے ہیں۔ عام طور پر اِن کا انسانی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اِن میں سے بعض زمین پر مقررہ فرائض سرانجام دیتے ہیں[6]۔ یہ خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ پاک باز انسانوں کی مدد کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کام آتے ہیں جن کے دل حیات کی اس بلندترین سطح کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہم اِن ملائکہ کو انسان کے معاون اور سرپرست فرشتے کہہ سکتے ہیں۔ یہ فرشتے حیاتیاتی توانائی ہیں اور اِن کا کام مجتمع کرنا اور تخلیق کرنا ہے۔[7]

وہ روحیں جن کا زمینی حیات سے واسطہ ہے مراجعت پذیر روحوں سے ملتی ہیں۔ یہ روحیں اِن پاک روحوں کو الوہی سُروں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ اور انہیں الوہی خوشی سے آشنا کرتی ہیں۔ اسی سے اِن زمینی روحوں کے مزید سفر کا تعین ہوتا ہے۔[8]

Marfat.com

2۔ جنات کی دنیا:

(ملکوتی دنیا کی نچلی سطح پر دنیا ہے۔ جو زمین اور ملکوتی دنیا کے درمیان ہے؟) روحیں فرشتوں کی دنیا سے گذر کر یہاں قیام کرتی ہیں۔ یہ ذہن اور شعور کی دنیا ہے جسے ہم روحانی دنیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ روح ذہن اور شعور کا مجموعہ ہے[9]۔ حضرت عنایت خانؒ جنات کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''جنات ذہن رکھتے ہیں لیکن اِن کا ذہن انسانی ذہن سے مختلف ہے۔ اِن کا ذہن نسبتاً خالص اور مصفا ہے۔ اور یہ ادراک کے نور سے منور ہے۔ جنات کا ذہن، خالی ہونے کی وجہ سے، ادراک اور ذکاوت میں انسانی ذہن سے بہت آگے ہے۔ جنات کا ذہن انسانی ذہن کی طرح تفکرات اور آلام کی آماجگاہ نہیں ہے۔ ہم جنات کے ذہن کو ایک جادوئی خالی جام سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جس میں علم بھرا جا سکتا ہے۔ جس میں ہر وقت بھرنے کی گنجائش رہتی ہے''۔[10]

جنات کی دنیا شاعری، میوزک، آرٹ، علوم، فلسفے اور تخیل کی دنیا ہے۔ جن وجدانی ذرائع سے علم حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے سنسکرت میں ''جانا'' کا مطلب علم ہے۔ جنات کی دنیا آزاد دنیا ہے اور زمینی دنیا کی طرح محدود نہیں ہے۔

جنات کی زندگی پرندوں اور جنگلی ہرنوں کی زندگی کی طرح ہے۔ جو فطری ماحول میں آزاد ہیں۔ اس دنیا میں وقت کا تصور انسانی تصورات سے ناقابل پذیر تضاد رکھتا ہے۔ اس لئے جنات کی زندگی کا سفر بھی انسانوں کی زندگی کے سفر کی نسبت طویل مگر پرسکون ہے۔ اس مقام پر روح جناتی جواہر مجتمع کر کے شعور تخلیق کرتی ہے۔ اس سطح پر شعور روح کے لئے لباس کا کام کرتا ہے۔ یہ مقام روح کے زمینی قیام کے لئے تربیت گاہ ہے۔ ہم اس دنیا کے خدوخال واضح نہیں کر سکتے کیونکہ ہم مادی اشکال کے عادی ہیں۔ اور مادی اشکال کا جناتی اشکال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جنات کا زمینی روحوں سے بھی تعلق ہے اور یہ روحیں ایک دوسرے کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ جنات آسانی سے انسان کی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی نسبت آزاد ہیں۔

تاہم اِس صورت میں ایک مشکل یہ ہے کہ انسان دنیوی خیالات اور اعمال و اشغال میں مگن ہونے کی وجہ سے جناتی (تخلیقی اور وجدانی) دنیا کے اثرات سے مزاحم رہتے ہیں۔

ایسے جنات جو مزید آگے جانے کی خواہش اور طاقت رکھتے ہیں مراجعت پذیر روحوں سے ملتے ہیں اور اُن سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ جنات اُن روحوں سے، حضرت عنایت خانؒ کے بقول، ''عالمِ موجودات میں تجلی پذیر ہونے کا علم پاتے ہیں''۔[11] وہ عمل انعکاس کے ذریعے واپس لوٹنے والی روحوں سے شعوری تاثرات وصول کرتے ہیں۔۔اور یہ واقعہ روح کو مادی لباس پہننے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مراجعت پذیر روحوں سے اثر یاب ہونے کے بعد جنات کے خالی اذہان اِن تاثرات سے لبالب بھر جاتے ہیں اور وہ وہی کچھ ہو جاتے ہیں جن کا اثر انہوں نے قبول کیا ہوتا ہے۔ اس طرح عالمِ ارواح کو لوٹنے والی روحوں جیسی شخصیات ایک بار زمین پر ظاہر ہوتی ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ کے نزدیک یہی تجسیمِ نو کا اصل فلسفہ ہے۔ انسان کی شناخت شخصیت ہے اور شخصیت ہی زمین پر نیا لباس پہن کر ایک بار پھر نمودار ہو سکتی ہے۔ جبکہ روح اپنے ماخذ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

3۔ مادی دنیا میں ظہور:

ظہور پذیری کے اس سفر کے دوران روح آخر کار طبیعی سطح پر پہنچتی ہے۔ روح کے جنم کو عموماً کیوپڈ یعنی کام دیو* کے جنم سے تشبیہ دی جاتی ہے جو مردوں اور عورتوں کے دلوں کا نشانہ لے کر تیر چلا رہا ہے اور اُن کی باہمی محبت کا ذمہ دار ہے۔ فلسفیانہ انداز سے دیکھا جائے تو اِس سے مراد یہ ہے کہ، زمین پر، تخلیق کی ہر سطح پر دوئی کا راج ہے اور اس سے فطرت کے دوہرے پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔[12]

اس طرح ایک محبت کرنے والا جوڑا نئی آنے والی روح کو طبیعی وجود کا تحفہ وصول کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔[13] ہر نومولود دنیا میں آتے ہی چلا اٹھتا ہے: ''کیوں!''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح اپنے آپ کو عناصر کے قید خانے میں محبوس پاتے ہی نالے سے دوچار ہوتی ہے۔ وہ جسم جو زمین پر پہنچنے والی اِس روح کو ملا ہے اُس روح کو پوری کائنات سے ملنے والا تحفہ ہے۔[14]

---

* حضرتِ عشق، محبت کا رومن دیوتا۔

Marfat.com

''روح کو والدین جسم کا تحفہ نہیں دے سکتے۔ آباؤ اجداد نہیں دے سکتے۔۔قوم یا نسلِ انسانی نہیں دے سکتی۔ بلکہ جو کچھ، جسم کی صورت میں، ایک روح کو ملا ہے وہ کچھ ہے جس تک دنیا صدیوں میں پہنچی ہے۔۔ کھنکھناتی ہوئی چکنی مٹی جسے لاکھوں مرتبہ گوندھا گیا ہے۔ اسے ہر مرتبہ اس لئے گوندھا گیا ہے کہ وہ ہر مرتبہ پہلے سے بہتر شکل اور صلاحیت سے مالا مال ہو پائے۔ یہ چکنی مٹی پہلی مرتبہ معدنیاتی دنیا میں نمودار ہوئی۔۔اس کے بعد نباتاتی دنیا میں ابھری۔۔ پھر اس کا جنم حیوانی دنیا میں ہوا۔۔اس کے بعد اُس مٹی کو وہ جسم عطا ہوا جس میں زمین پر آنے والی نووارد روحوں نے قیام کرنا تھا''۔[15]

ہاؤیائک (Hoyack) اس سفر کو ذو خطی ارتقاء کہتے ہیں۔ یہ ارتقاء کے افقی اور عمودی خطوط ہیں جن کا سنگم نسلِ انسانی کے جنم پر ہوتا ہے۔ اِن خطوط میں عمودی خط روح (soul) ہے۔ روح (spirit) ملکوتی دنیا سے سفر کرتی ہوئی مادے کی کثیف دنیا میں داخل ہوتی ہے۔ یہ تلفیف اور الجھاؤ کا عمل ہے جس کے ذریعے ارتعاشِ لطیف ارتعاشِ کثیف میں تبدیل ہو رہا ہے۔ افقی خط سے مراد طبیعی ارتقاء کا عمل ہے۔ جس کے ذریعے بنیادی حیاتیاتی خلیہ ارتقاء کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح انسان، جو اِن دونوں خطوط کا سنگم ہے، ظہور پذیری کے اس عظیم سلسلے کا نقطۂ عروج ہے۔[16]

لطافت سے کثافت کے اس سفر کا جائزہ لیتے وقت انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے:

''نا صرف انسان بلکہ عالمِ موجودات میں موجود سب کچھ خدائے بزرگ و برتر کا عکس ہے''۔[17]

لہٰذا زمین پر طبیعی ملبوس پانے والی روح حیات کے تینوں درجات کی (ملکوتی، جناتی اور انسانی) خصوصیات کی حامل ہے۔ اس روح کی خصوصیات کا انحصار اس بات پر ہے کہ اِس نے ملکوتی اور جناتی سطح پر کس قسم کے اثرات کو جذب کیا ہے۔ مثال کے طور پر جناتی سطح پر جذب کئے گئے خصائص زمین پر جنم لینے والی روح کو مخصوص تخلیقی اور فنکارانہ خصوصیات عطا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک فرد کی حیثیت سے کئی نسلوں کی یاداشت بھی ایک نومولود کو ورثے میں ملتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کے مطابق روح ملائکہ اور جنات سے صفات مستعار لیتی ہے اور اِنہیں مادی

Marfat.com

دنیا میں لے کر آتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ایک روح کو وہ ذمہ داریاں اور فرائض بھی ملتے ہیں جو اُن صفات سے منسلک ہوتے ہیں۔[18]

زمین پر قیام کے دوران روح زمینی خصوصیات جمع کرتی ہے۔ دراصل یہی خواہش روح کی نزولی حرکت کی وجہ ہے۔

''روح اپنے مادی مقصود کی قربت چاہتی ہے۔۔اسے اپنی ملکیت میں لینا چاہتی ہے اور اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ وہ مادی املاک کی حفاظت بھی چاہتی ہے تاکہ اسے کوئی چھین نہ لے۔اس مقام پر روحانی نظریۂ حیات اور اشتراکیت کے درمیان فرق بھی واضح ہوتا ہے۔ املاک (مادی و غیر مادی) کا حصول روح کی فطرت ہے۔ ایک اشتراکیت پسند املاک پسندی کی ہر شکل کو ناانصافی قرار دیتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب فطری ہے۔اس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے''۔[19]

ایک روح کو جسم اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کی مدد سے زندگی کا تجربہ کر سکے۔اور اس کا بھرپور استعمال کر سکے۔ جو کچھ دائرہ حواس میں ہے۔۔ جو کچھ ممکن المس ہے۔۔جسمانی آلات اس کا علم ممکن بناتے ہیں۔خارجی معلومات کے حصول کے لیئے قدرت نے ہمیں حواس خمسہ سے نواز ہے۔اس طرح یہ جسم ایک کانچ گھر کی مانند ہے۔ یہ آنکھ کے لئے صاف ہے لیکن دیگر حواس کی صورتِ حال بصارت سے مختلف نوعیت کی ہے۔[20]

''آنکھ آئینہ ہے اُس سب کا جو قابلِ دید ہے۔ یہ ہر اُس چیز کو منعکس کرتی ہے جسے یہ دیکھتی ہے۔ کان ایک مخصوص توانائی کی حامل آواز کو سنتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کان آواز کے لئے آئینہ ہیں۔ چھونے اور ذائقے کی صلاحیت بصارت اور سماعت کی نسبت خام ہیں۔ تاہم بلحاظِ نوع حواس ایک سے ہیں۔

جس طرح ہم اپنا عکس آئینے میں دیکھتے ہیں۔۔اسی طرح یہ جسم اور اس کے آلات آئینہ ہیں جن پر مادی کائنات کا عکس پڑتا ہے۔اگر یہ آئینہ دھندلا ہو جائے تو سب کچھ دھندلا ہو جاتا ہے۔زندگی دھندلا جاتی ہے۔ اس لئے جسمانی تطہیر روحانی پاکیزگی کا پہلا زینہ ہے۔صوفیائے کرام

Marfat.com

نے کہا ہے کہ جسم خدا (روح) کا گھر ہے۔ لیکن اس کی درست تشریح یہ ہے کہ جسم اس مقصد کے لئے ہے کہ اسے خدا کا گھر بنایا جا سکے"۔21

اس سے ظاہر ہے کہ جسم کی صفائی اور حفاظت بہت ضروری ہے۔ حضرت عنایت خانؒ جسم کی صفائی کو مذہب کا پہلا اہم اصول کہتے ہیں۔[22]

انسانی جسم خارجی حواس کے علاوہ ادراک کے باطنی آلات سے بھی لیس ہے۔ انسان وجدانی صلاحیتوں سے لیس ہے جن کی مدد سے دوسرے انسانوں کے جذبات اور احساسات کو جانا جا سکتا ہے۔ انسان اور فطرت کے داخلی رازوں کو جانا جا سکتا ہے۔ اگر انسان کے وجدانی آلات مہین اور تیز دھار ہوں تو مستقبل بینی بھی ممکن ہے۔

انسان کی مصنوعی اور مادی زندگیوں کی بدولت وجدانی آئینے دھندلا جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہماری زندگیوں میں انتشار اور اضطراب جنم لیتا ہے۔ انسان کی باطنی خواہش "دیکھنا" ہے اور جب تک اِس خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی بیتابی اور اضطراب انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اگرچہ وجدانی مراکز بھی جسم کے اندر موجود ہیں لیکن یہ خارجی حواس کے مقابلے میں لطیف ہیں اور ان کی "پرورش اور نشوونما" ایک لطیف ترین توانائی کرتی ہے جس کا ماخذ ذاتِ خداوندی ہے۔ یہ توانائی ہم عملِ تنفس اور پاکیزہ حرف وصوت سے پاتے ہیں۔ اس لئے روحانی تربیت میں الفاظ و انعاش کا کردار نہایت اہم ہے۔[23] (تفصیل کے لئے دسواں باب ملاحظہ فرمائیں)

دل اور دماغ دو اہم باطنی مراکز ہیں۔ صوفیانہ تربیت میں اِن دونوں کی تہذیب و تربیت پر زور دے کر اِن میں توازن پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک انسان کو جسم اُس وقت ملتا ہے جب اُس کا ذہن مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ زمین پر پیدائش سے قبل یہ محض آکاش تھا۔ ایک ایسا مقام جس پر زمین کے سفر کے دوران پڑنے والے گہرے تاثرات کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ آکاش اُس وقت ذہن بنتا ہے جب اُسے جسم مل جاتا ہے۔[24]

.....

Marfat.com

4۔ذہن کی خصوصیات:

حضرت عنایت خانؒ ذہن کو بھی آئینہ قرار دیتے ہیں۔[25] ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ جنات کی دنیا میں روح انعکاس کے ذریعے مراجعت پذیر روحوں سے شخصیت کے تاثرات حاصل کرتی ہے۔زمینی زندگی کے دوران انسانی شخصیت پر ان تاثرات کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

تاثرات کا تعلق حواس سے ہے۔جو کچھ ہم دیکھتے، سنتے، سونگھتے اور چکھتے ہیں ہم پر اثرات مرتب کرتا ہے۔اسی طرح ہمارے مختلف تجربات، شخصی تاثرات اور اعمال ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے افکار اور احساسات، گفتار و تحریر بھی ہماری قوتِ مدرکہ، یاداشت اور باطنی مراکز پر گہرے تاثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ تمام تاثرات ذہن کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔تاہم ذہن ایک آئینہ ہونے کے ناطے دیگر احساسات اور محسوسات کا رخ کر سکتا ہے۔

حضرت عنایت خانؒ اپنی مشہور کتاب The Mind World میں ہمیں بتاتے ہیں کہ انعکاس کا عمل اشیا کے ظہور میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔مثال کے طور پر حیوانات کی دنیا میں (جہاں گھوڑا انسان کی قوتِ ارادی کی تجسیم ہے جو اُس کا حکم مانتا ہے) اور نباتاتی دنیا میں جہاں، حالیہ تحقیق کے مطابق، مختلف قسم کے پودوں پر موسیقی اور محبت بھرے جذبات اثر انداز ہوتے ہیں۔انسانی ذہن پر پیدا ہونے والے اثرات اُس کے ماحول میں رچ بس کر اُس کے ماحول کو گھیر لیتے ہیں۔اس صورتِ حال میں بھی ذہن کو ایک آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے جو گرد و پیش کے عکس محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔تاہم ذہن ایک غیر متحرک اور انفعالی آئینہ نہیں ہے۔یہ یاداشت اور تخلیقی رجحان بھی رکھتا ہے۔

یاداشت کے ذریعے انسانی ذہن پر مرتسم ہونے والے اثرات قائم و ثابت رہتے ہیں۔بعض اوقات انسانی ذہن ان تاثرات سے ہٹ کر دوسرے خیالات میں محو ہو جاتا ہے لیکن ذہن پر پیدا ہونے والے نقوش توجہ پانے پر ایک بار پھر جاگ اٹھتے ہیں۔ اِن تاثرات کو دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔۔اِن کا ایک بار پھر تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ایک خیال کو جس قدر جگایا جاتا ہے وہ اسی قدر توانا ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس طرح ذہن انسان کے چنیدہ تجربات سے اُس کی کردار سازی کرتا ہے۔اس لئے جو کچھ ایک انسان کے ذہن میں بھرا ہے۔۔وہی کچھ اُس کے اعمال واشغال سے جھلکتا ہے۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اپنے ذہن پر موجود انمٹ نقوش کا نام ہے۔

انسانی ذہن تخلیقی رجحانات کا حامل بھی ہے۔وہ اپنے تاثرات پر مسلسل کام کرتے ہوئے انہیں نت نئے روپ عطا کرتا ہے۔وہ اُن تاثرات کے متعلق سوچ سکتا ہے۔اُن کے بارے میں اپنے احساسات کو گہرائی عطا کرتا ہے۔وہ اِن تاثرات اور احساسات کو بیان کرتا ہے اور انہیں اعمال میں ڈھالتا ہے۔یہ اثرات اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ اِنہی کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں مختلف حادثات اور واقعات جنم لیتے ہیں اور ہم بعض اوقات ان واقعات کی علتوں کو شعوری سطح پر نہیں جان پاتے۔اس طرح ہماری زندگیوں کا انحصار اُن احساسات اور تاثرات پر ہوتا ہے جو ہمارے ذہنوں پر حاوی ہوتے ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ذہن کے آئینے کے رخ کا تعین مختلف حادثات اور واقعات کرتے ہیں۔اس لئے ہمارے تجربات اور تاثرات ہمیں زندگی کے اُس موڑ پر لے آتے ہیں جس کی ہمیں خواہش نہیں ہوتی۔۔جس سے ہم بچنا چاہتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک مرتبہ ناکام ہونے والا شخص ناکامی سے اس قدر خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ وہ کوشش ترک کر کے ہمیشہ کے لئے ناکامی کا طوق گلے میں ڈال لیتا ہے۔

ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری زندگیاں خارجی واقعات کی غلام نہ ہونے پائیں۔تاکہ باطنی تمناؤں اور خارجی موسموں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔کیونکہ ذہن کے پیچھے روح ہے۔۔جو الوہی توانائی ہے۔۔جو خدا کی تخلیقی توانائی کا حصہ ہے۔یہ توانائی ہماری زندگیوں کو بلند و برتر راستوں پر ڈال سکتی ہے۔تاہم ایسا کرنے میں ہم صرف اُسی وقت کامیاب ہو پائیں گے جب ہم اپنے آپ کو جان لیں گے۔جب ہم اپنے اندر خدائی توانائی کو جان لیں گے۔عرفانِ نفس ہم پر یہ ذمہ داری عائد کرے گا کہ ہم نہ صرف اپنے افعال واعمال بلکہ خیالات واحساسات کو اُس الوہی توانائی کی طرح پاک رکھیں جس سے ہمارا باطن مزین ہے۔ہمیں اس بات پر توجہ دینی ہو گی کہ ہم کن تاثرات کے تابع ہیں اور ناپسندیدہ اثرات سے کس طرح پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔حضرت عنایت خانؒ اسے ''توجہ اور عدم توجہی کا فن'' کہتے ہیں۔۔''سننے اور نا سننے'' کا ڈھنگ کہتے ہیں۔

توجہ اور عدم توجہی، سننے اور نا سننے کا فن سیکھ کر ہم زندگی کے بلند مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلند مقاصد کیا ہونے چاہئیں۔ہماری زندگیوں کا کیا مقصد ہے؟

Marfat.com

اپنی کتاب The Purpose of Life میں فرماتے ہیں:

''روحانی راستوں پر پہلا قدم اُس وقت اٹھتا ہے جب ایک انسان دنیا میں اپنے مقصد کا تعین کر لیتا ہے''۔[26]

اس مقام پر وہ شیخ سعدیؒ کا حوالہ دیتے ہیں۔شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

''ہر روح ایک خاص مقصد کے تحت زمین پر اتری ہے۔۔۔اِس مقصد کی چنگاری ہر روح میں بھڑکنے کی منتظر ہے''۔[27]

5۔حصول کا راستہ:

اگر تلاش خالص ہو تو مقصد مل ہی جاتا ہے۔اور اگر ہم اِس مقصد کے حصول کی خواہش زندہ رکھیں ہماری زندگیاں بامعنی ہوسکتی ہیں۔شروع میں ہم کسی مادی مقصد کے حصول کے لئے اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔حضرت عنایت خانؒ کے بقول ''مادی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اٹھنے والا قدم بھی روحانی راستوں پر اٹھنے والا پہلا قدم ہوسکتا ہے''۔اس مقصد کے حصول کے لئے کام کرنے کے دوران ہم جان لیتے ہیں کہ اگر ہم کوشش جاری رکھیں تو ہم اپنا مقصود پا سکتے ہیں۔تاہم جب ہم یہ مادی مقصد پورا کر لیتے ہیں تو ہماری نظریں نسبتاً بلند مقصد پر جم جاتی ہیں۔۔اور یہ سلسلہ کچھ عرصے تک جاری رہتا ہے۔

حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''آخر میں تمام مقاصد ایک مقصد میں فنا ہو جاتے ہیں جو صوفی کا مقصد ہے۔''ایک'' کے ساتھ ایک ہونے کا مقصد''۔[28]

اس کے بعد حضرت عنایت خانؒ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم صوفیانہ مقصد کا حصول کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔اُن کے نزدیک روحانی منزل کو پانے کے لئے پانچ خواہشات کی تطہیر لازم ہے۔ان پانچ خواہشات میں زندگی کی خواہش، جاننے کی خواہش، طاقت کے حصول کی خواہش،، خوشی کی تمنا اور امن کی خواہش ہیں۔یہ وہ خواہشات ہیں جو عام طور پر انسان کے دنیوی مقاصد کی بنیاد بنتی ہیں۔حضرت عنایت خانؒ ہمیں عملی اور نفسیاتی طریقہ ہائے کار سے آگاہ کرتے ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے ہم اپنی اِن خواہشات کو پورا کر سکتے ہیں اور اپنے راستے میں حائل

Marfat.com

مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ راہِ حصول میں بیان کردہ تعلیمات ہماری مادی زندگی کے لئے نہایت اہم ہیں۔ اُن کی یہ تعلیمات ابھی تک کتابی شکل میں دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم اِن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

دنیوی کامیابیوں کے حصول کے لئے پہلا قدم ''ارتکاز'' ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی پوری توجہ، خیالات اور احساسات اپنے مقصد پر مرکوز کردیں۔ ہمیں یہ ''اعتماد'' ہونا چاہیے کہ ایک دن ہم مشکلات کے باوجود اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہونگے۔ اس کے علاوہ مشکلات پر قابو پانے کے لئے ''عقلی تقاضوں پر پورا اترنا'' بھی نہایت ضروری ہے۔ ہمیں اپنے مقصد کی طرف بتدریج آگے بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ ہم جلد بازی سے کام لے کر اپنی تمام تر توانائیاں پھونک کر اپنے مقصد سے دور ہٹ سکتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

> ''اِس دنیا میں کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو فاضل جوش وخروش کا شکار ہوکر اپنے مقصد کو آگے دھکیلتے رہتے ہیں۔۔ جیسے اُن کا مقصد کوئی فٹ بال ہو۔ پہلے پہل ہمیں اپنے آپ کو مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنا چاہیے۔ اس کے لئے مطلوبہ توانائی کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اس کے لئے ''صبر واستقامت'' کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر قدم اٹھانے کے لئے موزوں وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ صبر مشکل ہے لیکن اس کے بغیر باطنی توانائی کی تعمیر ناممکن ہے۔
>
> اس کا مطلب یہ ہے کہ آغاز سے انجام تک ضبطِ نفس کے زریں اصول کی پیروی ضروری ہے۔ اپنے مقصد پر نگاہ رکھتے ہوئے، غصے اور بے جا جذباتیت سے پہلو بچا کر انسان اپنے راستے پر مسلسل سفر جاری رکھے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اپنے مقاصد پر خاموش رہنے کے لئے بھی ضبطِ نفس کی اشد ضرورت ہے۔ خاموش رہ کر ہم اپنی توانائی بچاتے ہیں جو ہمارے مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

Marfat.com

اس طرح ایک انسان بے جا تنقید اور مخالفت سے بھی بچ جاتا ہے۔ جب ہم اس انداز سے اپنا کام جاری رکھتے ہیں تو ہم اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ اسے روحانی کفایت شعاری کہتے ہیں اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ روح کی خدائی طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "انسان کے اندر موجود پاک روح انسان کے مقاصد کو اپنی طرف کھینچنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے اور وہ پاک روحوں کی مصفا خواہشات ضرور پوری کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے۔۔ مانگو اور تمہیں دیا جائیگا۔۔ تلاش کرو اور تم پالو گے۔ دستک دو۔۔ اور یہ دروازہ تمہارے لئے کھل جائے گا"۔ [29]

حصول کے راستے پر چلتے چلتے ہم بتدریج بلند سے بلند مقاصد کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ پانچ بنیادی خواہشات، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، ہمیں آخری اور عظیم و بلند خواہش تک لے جاتی ہیں۔ ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ طبیعی زندگی مختصر ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ ابدی حیات کا استحقاق صرف روح کے پاس ہے۔ زمینی و طبیعی علوم عارضی ہیں اور ہم اس کے برعکس الوہی دانش کے حق دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہم خداوندِ کریم کے سایے میں سمٹ کر کشادہ ہو جاتے ہیں اور حقیقی روحانی خوشی پا لیتے ہیں۔ روحانی خوشی جو دنیوی خوشیوں کی طرح عارضی و فانی نہیں ہے۔

روح کی خواہش پوری ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ روح اپنے آپ سے آشنا ہوتی ہے۔ عرفانِ نفس یہی ہے کہ انسان اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر سراغِ حیات پا لے۔ وہ جان لے کہ اُس کے اندر خود زندگی کے سرچشمے موجزن ہیں۔ اور پھر وہ اُس مستقل ذات سے روشن ہو جائے۔۔ اُس میں مٹ کر انمٹ ہو جائے۔۔ اُس میں بُجھ کر ہمیشہ کے لئے روشن ہو جائے۔ انسانی ذات ذاتِ خداوندی کی کرن ہے۔ ہمارے جسم اور ذہن کے اندر خدائی شعور موجزن ہے لیکن ہم دنیوی تجربات سے ماورا ہو کر اِن عظیم توانائیوں کو آزاد نہیں کر پائے۔۔ ہم اِن کا استعمال نہیں کر سکتے۔

انسان سب سے پہلے عارضی دنیا میں عارضی اور غیر مستقل خوشیوں کی تلاش کرتا ہے۔۔ اور پھر مستقل اور دائمی خوشی کی تلاش میں ذات کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اس مرحلے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

''انسان آنکھ کی مدد سے دیکھتا ہے لیکن آنکھ کو نہیں دیکھ سکتا۔ آنکھ کو دیکھنا ہو تو اُسے آئینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنی حقیقت کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ تو ہمیں جسم اور ذہن کے آئینوں میں دیکھنا ہے۔۔ ان کی مدد سے ہم اپنے اندر ایک خود مکتفی ذات دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے روحانی راستوں پر چل کر۔۔ مراقبے کے ذریعے۔۔ روحانی دانش کے ذریعے اپنے آپ کو ایک آئینہ ہی تو بنانا ہے''۔[30]

اس کتاب کے آٹھویں باب میں تصوف، روحانی اصول و مبادیات سے آشنائی اور مراقبے پر بات ہوگی۔ تصوف کی راہ کی منزل خدائی شعور اور خلوص کا حصول ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر ہم جان لیتے ہیں کہ روح مادی دنیا میں کیوں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''اس سوال کا جواب ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔۔ تسکین کی خاطر۔ یہاں پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ خدا اس سے قبل اطمینان اور تسکین کیوں محسوس نہیں کر رہا تھا؟۔۔ اس لئے کیونکہ خدا واحد ہستی ہے اور ہستی کی فطرت ہی ہستی کا شعور پانا ہے۔ یہی شعور کئی راستوں، ناموں اور شکلوں سے ہستی کا تجربہ کر رہا ہے۔ انسان میں یہ شعور عروج سے آشنا ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کے ذریعے خدا ہستی کی بلند حالت کا تجربہ کرتا ہے''۔[31]

Marfat.com

6۔حیات بعداز ممات: مراجعت

زمینی حیات کے خاتمے پر موت کھڑی ہے۔ ہر اُس چیز نے مٹنا ہے جو نہیں تھی اور پھر وجود میں آئی۔موت اُس وقت بھی آسکتی ہے جب ہر روح اپنا مقصد پورا کر چکی ہو۔۔جب اُس کی کلی کھل کر پھول بن چکی ہو۔اس کے بعد کوئی روح جسم کی قیدی نہیں رہتی۔اس کی سب سے اہم مثال پیغمبروں کی حیات ہے۔جب بھی پیغمبر اپنا مشن مکمل کر لیں اُن کے وصال کا وقت آن پہنچتا ہے۔

> ''کسی نہ کسی وجہ سے یہ جسم ناتواں ہو جاتا ہے اور روح کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ یہ اسے راستہ دیتا ہے اور روح فطری انداز میں رخصت ہو جاتی ہے۔اِس الوہی مکین کے جانے کے بعد مادی جسم بالکل اُدھڑے ہوئے کوٹ کی مانند ہے جسے پہننے والا اس لئے پھینک گیا ہو کہ اُسے اِس کی ضرورت نہیں رہی''۔[32]

اگر کسی روح کے مقاصد اور خواہشات پوری نہیں ہو سکیں۔تو زندگی سب سے پہلے جناتی سطح پر منتقل ہو جاتی ہے۔موت ایک واہمہ ہے۔اور یہ واہمہ اس لئے جنم لیتا ہے کہ انسان مادی حیات اور رشتہ و پیوند کو ہی زندگی سے مشروط کر لیتا ہے۔انسان اُس عرصے کو زندگی سمجھتا ہے جب وہ جسمانی بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔جسم بھی ایک پاکیزہ چادر کی مانند ہے جسے جوں کا توں لوٹانا ہے۔اور موت۔۔موت دراصل ایک زندگی سے دوسری زندگی میں قدم رکھنا ہے۔

جس طرح حضرت عنایت خانؒ روحانی ہبوط کا نقشہ کھینچتے ہیں بالکل اسی طرح انہوں نے روحانی ارتقاء اور رجعی راستے میں آنے والے ہر پڑاؤ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عنایت خانؒ کی روحانی دانش اُن کی ذاتی روحانی ''نظر'' کا ثمر ہے۔ ہم اِسے کتابی و اکتسابی ''خبر'' نہیں کہہ سکتے۔یہ سب اُس تعلق۔۔اُس ربط کا نتیجہ ہے جو ایک ولیِ کامل اپنے رب سے استوار کرتا ہے اور اُس کا خالی کشکول دانشِ روحانی سے بھر جاتا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے حالیہ دور میں اُن لوگوں کے تجربات کے عین مطابق ہے جو قریب المرگ تھے۔[33]

Marfat.com

بہت سے ایسے لوگ جو کسی مہلک بیماری سے صحت یاب ہوئے ہیں یا جنہیں کسی جان لیوا حادثے کے بعد نئی زندگی ملی ہے۔ اِن لوگوں نے صاف محسوس کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے عنصری مکین گاہوں سے ماورا ہو کر اپنی روحانی حقیقتوں کا سراغ پایا ہے۔ بعض لوگوں نے آپریشن ٹیبل پر موت اور حیات کے درمیان لٹکے ہوئے ڈاکٹروں کی آوازوں کو سنا اور انہیں چند لمحات کے لئے ''دوسری دنیا'' میں رہنے کا موقع ملا۔ اور حیران کن بات یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے تجربات کو بیان کر سکتے تھے۔

اِس قسم کے بیانات، جو مختلف لوگوں نے دیے ہیں، حیران کن حد تک دوسرے لوگوں کے بیانات سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ تاہم صرف چند لوگ ایسے تھے جو اُن لمحات کو یاد کرنے سے قاصر تھے۔[34]

حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں کہ مرنے والا شخص، جو اس بات کا قائل ہے کہ موت فنا ہونے کا نام ہے، کچھ دیر کے لئے مفلوج ہو جاتا ہے۔۔ اور یہ تصور کہ موت زندگی کو فنا کر دیتی ہے۔۔ اُس شخص پر جمود طاری کر دیتا ہے۔ اس حالت کو ہم ''پاک ہونے کا مقام'' کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اِس کے بعد زندگی کی ایک نئی امنگ جنم لیتی ہے۔ اور زندگی ایک نئی اور نسبتاً خالص سطح پر مقیم ہو جاتی ہے۔ ایسی روحیں جو حیات بعد از ممات کی قائل ہیں فوراً دوسری زندگی سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیتی ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ اِس نئی دنیا کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''اس روشن دن میں روحیں کیا دیکھتی ہیں؟ انہیں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ گذشتہ زندگی ہی گذار رہی ہوں۔ جیسے اُن کا وہی نام ہو۔۔ وہی شکل ہو۔ لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہوں۔ اس دنیا میں روحیں اپنے آپ کو پہلے کی نسبت زیادہ آزاد تصور کرتی ہیں۔ اب اِن روحوں کے سامنے ایک نئی دنیا ہے۔۔ یہ دنیا اُن کے لئے اجنبی دنیا نہیں ہے۔ یہ وہی دنیا ہے جو انہوں نے زمین پر رہتے ہوئے اپنے لئے تشکیل دی ہے۔ جسے دنیوی حیات کے دوران شعور سمجھا جاتا ہے موت کے بعد کی زندگی میں وہی ہمارا گھر ہوگا۔۔ وہی ہماری دنیا ہوگی۔ جو کچھ دنیا میں تخیل کہا جاتا ہے۔۔ موت کے بعد اس کی مدد سے تخلیق کی گئی دنیا حقیقت بن جائے گی۔ اگر یہ دنیا فنکارانہ دنیا ہے۔۔ یہ فن روح کا پیدا کردہ ہے۔ اگر، کسی روح کے

Marfat.com

لئے، اس دنیا میں حُسن نہیں ہے۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ زمینی حیات کے دوران اُس روح کا حُسن سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ایسی روحوں کی بعد ازممات حیات حُسن سے خالی ہوگی جو یہ بھول چکی ہیں کہ خدا خوبصورت ہےاور خوبصورتی سے پیار کرتا ہے''۔[35]

موت کے بعد روح شعور کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ہماری موت کے بعد کی زندگی کا فیصلہ ذہن پر جڑی ہوئی خواہشات ۔۔ یاداشت پر رقم کردہ انمٹ تجربات کرتے ہیں۔ جنت اور جہنم کی حقیقت یہی ہے۔ جب ہم زمین پر خوش ہوتے ہیں ۔۔ ہم دوسرے لوگوں کی خوشیوں کا خیال رکھتے ہیں ۔تو ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اِس خوشی اور طمانیت کو دوسری حیات میں اپنے ساتھ لے جاسکیں ۔ جب ہم حسد،خودمرکزیت،نفرت کا شکار رہے ہوں اور دنیا میں ہم نے دُکھ ہی بانٹے ہوں ہم یہ زہر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ۔اس لئے شروع میں،ہم انہی خیالات اوراحساسات کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں جن کے ہم دنیا میں عادی ہوتے ہیں۔[36]

موت کے بعد کی زندگی میں ہم اِس قدر محدود نہیں ہوتے ۔روح آخر کار اُن معیارات سے واقف ہو جاتی ہے جو اُس کا نصب العین تھے۔اور اِس کے بعد روح وہی کچھ کرنے لگتی ہے جو اِس کی خواہش تھی۔[37] دوسری دنیا میں روح کو آزادی میسر آتی ہے اور حدود گر جاتی ہیں۔اس لئے اس دنیا میں روح کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے زیادہ قوت مل جاتی ہے۔اس دنیا میں بھی روح کے پاس ذہنی یا روحانی جسم ہوتا ہے۔اس جسم کی نوعیت کے بارے میں حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''یہ جسم بالکل ویسا لگتا ہے جیسا یہ زمین پر تھا۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیونکہ انسان کو اپنے جسم سے پیار ہے۔کیا اس کا جسم بدل جاتا ہے؟ اگر انسان ایسا چاہے تو یہ ہوسکتا ہے۔ اگر روح لباس بدلنا چاہے تو جسم بدل سکتا ہے۔کیونکہ یہ روح کی خواہش کا احترام کرتا ہے!''[38]

اس مقام پر انسان خالص زبان میں کلام کرتا ہے جو انسانی زبان سے زیادہ موزوں ذریعۂ کلام ہے۔اس مقام پر کچھ بھی ماورائے کلام نہیں ہے۔اپنے مُبداُ اصل کی طرف لوٹنے والی روحیں اذہان بھی رکھتی ہیں اور اگر یہ دیکھنا چاہیں تو زمین پر واقع ہونے والے حالات کو دیکھ سکتی ہیں۔[39] یہ روحیں زمین پر موجود روحوں سے کلام بھی کر سکتی ہیں۔زمینی زندگی گذارنے والی روحیں

واضح طور پر ان کی بات نہیں سن سکتیں۔ کیونکہ زمین پر زندگی گذارنے والے عنصری دیواروں کے قیدی ہیں۔ تاہم زمین کے مکین لاشعوری طور پر اِن روحوں کو سن سکتے ہیں اور اُن کی خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے وہ اپنی ہی خواہشات کی تکمیل کر رہے ہوں۔[41]

مُوڈی کی کتاب The Life After Death میں قریب المرگ واقعات کے ریکارڈ حضرت عنایت خانؒ کے مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اس شہرۂ آفاق کتاب میں ایک ایسے مقام کا ذکر کرتے ہیں جہاں حدود مٹ جاتی ہیں۔ اس مقام کو وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''اس مقام کے بارے میں آپ کچھ اس طرح سوچ سکتے ہیں ایک شخص دوسرے شخص کی نسبت بلند مقام پر مقیم ہے۔ وہ دنیوی زندگی کو دیکھ سکتا ہے۔ لوگوں کی آواز سُن سکتا ہے۔ لیکن زمین پر بسنے والے لوگ اُس کی آواز نہیں سن سکتے''۔[42]

مُوڈی ''روحانی اجسام'' کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روحانی جسم لاشے (nothing) نہیں۔ تاہم اسے شے (thing) بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہمارا زمینی تجربہ اس کی نظیر نہیں پا سکتا۔ یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ روحانی ''جسم'' کی کوئی نہ کوئی شکل یا حالت ضرور ہے۔ لیکن ہمارے شکل اور حالت کے تصورات میں حدود حائل ہیں لیکن خالص روحانی دنیا میں جسم حدود کی دنیا سے نکل کر ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں تحدید کی موت واقع ہو جاتی ہے''۔[43]

مقدس کتب میں موت کے بعد یومِ حساب کا تصور موجود ہے۔ اس کے علاوہ اِن کتب میں یہ بھی لکھا ہے کہ فرشتے انسان کے نیک اور بد اعمال کی قدر پیمائی کا فریضہ سر انجام دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب روح سے جسم کا ملبوس اتر جائے گا تو ذہن بالکل صاف ہو جائے گا اور روح اپنی روحانی زندگی کو صاف صاف دیکھ پائے گی۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''نیکی اور بدی کا حساب رکھنے والے ملائکہ سے مراد انسان کا دل ہے۔
ہمارے تمام اعمال کا ریکارڈ اس پر محفوظ کیا جا رہا ہے''۔[44]

Marfat.com

مُوڈی کہتے ہیں:

''حساب کوئی خارجی عمل نہیں؛ داخلی عمل ہے۔ یہ کوئی خارجی روشنی نہیں بلکہ داخلی روشنی ہے جو انسان پر اس کی ساری زندگی روشن کر دیتی ہے۔ اور سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے''۔[45]

موت کے بعد کی زندگی میں انسانی ذہن حدود اور دنیوی تمناؤں کے بوجھ سے آزاد ہو جاتا ہے کیونکہ روح اپنے آلات کا، دوسری دنیا میں جانے سے قبل، خود ہی علاج کر لیتی ہے:

''روح بیماری کے تمام تاثرات دھو ڈالتی ہے۔ تمام زخم مندمل کر دیتی ہے۔ تمام مصائب اور دنیوی کثافتیں ختم کر دیتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو تمام بیماریوں اور بیماریوں کے اثرات سے پاک کر لیتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو زندگی کی اِس نئی سطح کے مطابق بناتی ہے''۔[46]

اس طرح روح اس نئی سطح پر قیام کرتی ہے جہاں وقت کے زمینی معیارات ہوا ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز زیادہ دیر رہتی ہے[47]۔ اس مقام پر روح اُن روحوں سے ملتی ہے جن کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور اِن پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ زمین پر آنے والی روحوں نے اُن فرائض کو سرانجام دینا ہوتا ہے جو مراجعت پذیر روحوں نے سرانجام دینے تھے۔[48] یہ واپس لوٹتی ہوئی روحیں انعکاس کے عمل کے دوران اپنی خصوصیات زمین پر جانے والی روحوں میں تقسیم کرتی ہیں لیکن اپنی اصل حالت برقرار رکھتی ہیں۔[49] جب بھی روحیں شعوری طور پر عملِ انعکاس کے دوران اپنی خصوصیات وقف کرتی ہیں تو زمین کی طرف جانے والی روحیں گہرے لطف کا تجربہ کرتی ہیں[50]۔ روحوں کا آپس میں یہ رشتہ بالکل ایسا ہے جیسے ماں باپ اور اولاد یا پھر استاد اور شاگرد کا رشتہ۔[51]

اسی دوران اوپر اٹھنے والی روحیں اپنے آپ کو جناتی دنیا میں اپنے غیر تکمیل شدہ مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مصروف کر لیتی ہیں۔

''یہ ایسے مقاصد ہیں جو زمینی حیات کے دوران نامکمل رہ گئے تھے۔ اب انہوں نے بلندی اور ارتقاء کے اس سفر کے دوران تکمیل پانا ہے۔ کیونکہ انسان کا دل جو بھی خواہش کرے وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ اگر یہ خواہشات زمین پر پوری نہ ہو سکیں۔۔ آخرت میں پوری ہو جاتی ہیں۔ انسانی دل کی اصل خواہش خدائی تمنا ہے۔ اس لئے اسے ایک

Marfat.com

دن ضرور پورا ہونا ہے۔ اگر اس خواہش کے پورا ہونے کا وقت اُس وقت نہ آئے جب روح زمین کی باسی تھی۔۔ یہ روحانی دنیا میں ضرور پوری ہوتی ہے''۔[52]

حضرت عنایت خانؒ کا وژن کس قدر مثبت اور فیضان خیز ہے۔ ہمارے تمام دنیوی مسائل، مصائب اور مایوسیاں ایک روز ختم ہو جاتی ہیں۔ پیغمبروں اور صوفیائے کرام نے حزن و آلام کی موت کے وقت کو ہی آخرت کہا ہے۔ کیونکہ:

''روح کا ماخذ مکمل اور جامع ذات ہے۔ بالکل اسی طرح روح کے مقاصد اور منازل بھی جامع اور مکمل ہیں۔ اس لئے زمین پر بندش اور تحدید کے باوجود روح تکمیل و اتمام کی لپٹ رکھتی ہے۔ اور تکمیل کا مطلب ہے ''طلب کا نہ ہونا''۔ روح زمین پر حدود اور بندشوں کا تجربہ کرتی ہے اور اس کے باوجود مکمل ہونے کی تمنا اس میں موجود رہتی ہے۔۔ روح تکمیل پانے کی تمنا سے مالا مال ہے۔ تکمیل کی یہ خواہش۔۔ جہاں طلب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔۔ ایک دن ضرور پوری ہوتی ہے کیونکہ روح کا ماخذ اور سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے جو مکمل ہے''۔[53]

روح جادۂ تکمیل پر کسی بھی قسم کی جراحت سے ضرر پذیر نہیں ہو سکتی۔ زمین پر اُس کے بُرے تجربات سے بھی اُس کی الوہی خواہشات زندہ رہتی ہیں۔ اِن بُرے تجربات سے انسان کے ذہن کا آئینہ ضرور گدلا ہو جاتا ہے لیکن روح۔۔ جس کا ماخذ منزہ و مصفا ذات ہے۔۔ اپنی ازلی اور بے عیب تجلی برقرار رکھتی ہے۔ نہ صرف روح خود خالص رہتی ہے بلکہ ذہن کو بھی کثافتوں سے پاک کرتی رہتی ہے۔ اور ایک دن اس سے جُدا ہو کر اپنے ماخذ میں کھو جاتی ہے۔

اپنی منزل کی طرف اِس سفر کے دوران روح جناتی دنیا کو الوداع کہتی ہے اور ملکوتی دنیا میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ نقل مکانی بھی موت ہی ہے۔ لیکن یہ موت حیات کے طویل ترین تجربے کے بعد آتی ہے۔ تاہم یہ موت زمینی موت کی طرح تکلیف دہ نہیں ہے کیونکہ اس مقام پر، زمین کے برعکس، کچھ بھی خام اور کثیف نہیں ہے۔ لیکن ہر خواہش کے پورا ہونے کے بعد روح ایک تبدیلی ضرور محسوس کرنے لگتی ہے۔[54]

7۔ ملکوتی دنیا میں واپسی:

جناتی جسم کو ''الوداع'' کہنے کے بعد روح ایک بار پھر ملکوتی دنیا میں لوٹ آتی ہے۔ یہ تمام تفکرات پیچھے چھوڑ آتی ہے لیکن اپنے احساسات ساتھ رکھتی ہے۔۔وہ احساسات جو اِس مقام پر اِس کا اثاثہ ہیں۔ جنہیں اس نے حیات کے ہر مقام پر چنا ہے۔ اس مقام پر روح ارتعاشِ خالص کی صورت میں حیات کرتی ہے۔ اِس وقت یہ ایک آواز ہے۔۔ اسمِ اعظم ہے۔۔ سُر ہے۔ یہ مقامِ نور ہے اور روح کا اگلا قدم نورِ ازلی کا وصال ہے۔ روح اس مقام پر بھی جسم رکھتی ہے۔ لیکن۔ روشنی کا جسم۔۔نور کا جسم۔ اس مقام پر روح قابلِ سماعت اور ممکن الفہم ہے۔ جناتی اجسام کے مقابلے میں ملکوتی اجسام کشادہ ہیں۔ اس کے باوجود ایک انسان جناتی اور ملکوتی خصوصیات کا سنگم ہے۔ ملائکہ نورِ ازلی کے گرد حیات کرتے ہیں۔ ہم اُن کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی پھول ہے اور ملائکہ تتلیاں ہیں جو نورِ ازلی میں ہی جیون رس پاتی ہے۔

> ''ملائکہ حسنِ ازلی کا دیدار کرتے ہیں۔۔نورانی ہواؤں میں سانس لیتے ہیں۔ اِن کی دنیا کامل آزادی کی دنیا ہے جس میں وہ ہردم خدا کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ملائکہ کی دنیا میں زندگی ایک مسلسل ساز کی مانند ہے۔ اسی لئے دنیا بھر کے حکماء نے موسیقی کو ملکوتی یا ربانی فن کہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ملائکہ کی دنیا ارتعاشِ لطیف کے علاوہ کچھ نہیں ہے''۔[60]

اس لئے ملائکہ کو میسر خوشی انسانوں اور جنات کی خوشی سے کہیں زیادہ اور خالص ہے۔ اُن کے ہاں صرف ایک خواہش ہے۔۔نورِ ازلی کا قرب۔۔اُس نور سے ایک ہوجانا جو اُن کا ماخذ ہے۔۔اُن کی حقیقت ہے۔

ملکوتی دنیا میں بھی، جیسا کہ ہم پہلے بات کر چکے ہیں، اِن روحوں کی ملاقات زمین کے لئے رخصت ہونے والی روحوں سے ہوتی ہے۔ ملکوتی دنیا میں قیام کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ روحیں محبت، ہم آہنگی اور حُسن کی اِس دنیا کو الوداع کہتی ہیں کہ وہ دوبارہ اپنے ماخذ میں تحلیل ہوجائیں۔ یہی وہ مقام تھا جس کی کشش انہیں صدیوں سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔[57] اس کے

Marfat.com

بعد روح اپنے نورانی ''لباس'' سے آزاد ہوکر حُسن ازلی کے نور کی منزل پا لیتی ہیں۔

''روح کو ہر وقت روحِ کُل اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ جونہی روح اپنی منزل پا لیتی ہے اُسے بے مثال لطف کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسا لطف جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تجربہ، کچھ حد تک، اُس زمینی تجربے سے ملتا ہے جب کوئی صدیوں سے بچھڑے ہوئے محبوب کی باہوں میں ڈوب جائے۔ وہ محبوب جس کو پانے کی تمنا میں ہی کسی نے زندگی بسر کی ہو۔ اسی مقام پر روح انفرادی شعور قربان کر دیتی ہے اور قطرہ قلزم میں فنا ہوتے ہی قلزم بن جاتا ہے۔ اور انفرادی شعور کے فنا ہوتے ہی روح خالص شعور کو ہمیشہ کے لئے پا لیتی ہے''۔[58]

لیکن شعوری طور پر اس مقام کی تفہیم اور انفرادی شعور کے الوہی شعور میں فنا ہونے کے تجربے میں فرق ہے۔

''ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ منزل کسی کو اُس وقت کھینچ لے جب کوئی منزل کی جانب پیٹھ کر کے کھڑا ہو۔ اور یوں تو اکثر ہوتا ہے کہ ایک شخص منزل کے لئے مسلسل سفر کرے۔۔ ہر قدم پر منزل کے قریب ہونے کا لطف حاصل کرے۔ ایسی روح جو قدم بہ قدم۔۔ زینہ زینہ اپنی منزل کے قریب ہو رہی ہو کیا محسوس کرتی ہے؟ اُسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر پردہ ہٹ جانے کے بعد اُسے پہلے سے بہتر زندگی ملتی ہے۔ آخر کار وہ یہ جان لیتی ہے کہ وہ کسی پرچھائی کو حقیقت سمجھ رہی تھی۔ منزل پر پہنچ کر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سورج تھی لیکن وہ اپنے آپ کو سورج مکھی سمجھ کر خوش ہو رہی تھی''۔[59]

Marfat.com

باب 7

من و یزداں

1۔ خدا کے تصورات:

انسان اور خدا کے درمیان رشتے کو کیا نام دیا جائے؟ خدا جو روح کا ماخذ ہے۔ جو خالقِ کائنات ہے اور انسان مخلوق ہے۔

انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اِس رشتے کو جان سکے۔ تاہم یہ سب اس لئے مشکل ہے کہ ہم مادے کی دلدل میں گردنوں تک دھنسے ہوئے ہیں۔ ہم صرف خارجی حواس کے سہارے زندگی گذار رہے ہیں۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مادہ پرستی کے جنون میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود نورِ ازلی کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی تمنا ہر دل پر جڑی ہے۔

اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انسان نے سب سے پہلے سورج کی عبادت کیوں کی۔ کیونکہ سورج ہر روز طلوع ہو کر اُسے حیات آور گرمی عطا کرتا تھا۔۔ وہ انسان سے دُور تھا اور اُس کی زندگی کی بنیادی شرائط میں سے ایک تھا۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے روح کی تخلیق کے عمل کو جاننے کے لئے سورج اور اُس کی کرنوں کا حوالہ دیا۔۔ کیونکہ ہم اس کی مدد سے تخلیقی سلسلے کی رمز کشائی کر سکتے ہیں۔

تاہم جب انسان نے اپنے علم کی بنیاد سائنسی اصولوں پر رکھی۔ کائنات، سیاروں اور ستاروں کا علم حاصل کیا تو اُس کے لئے خدا کے اس قدیم ترین تصور پر قائم رہنا ممکن نہ رہا۔ انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ خدا انسان کے دائرۂ حواس سے باہر ہے۔ انسان کے خارجی حواس اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کے باوجود ہم انسان اُس حقیقتِ مطلقہ کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ خدا سے ٹوٹے ہوئے اس رشتے کو ازسرِ نو استوار کرنے کے لئے اُس کا غیر مرئی تصور درکار تھا۔

انسان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اُس کا محدود ذہن اُس لامحدود ہستی کا جامع تصور قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ، جیسا کہ حضرت عنائیت خان گیان میں لکھتے ہیں:

''عالم موجودات میں ہر چیز کی ضد موجود ہے۔ لیکن خدا اس اصول سے مستثنٰی ہے۔ انسان کے ذہن میں مختلف تصورات اضداد کی وجہ سے قائم ہیں۔۔ اس لئے اضداد سے پاک ہستی ہمارے محدود تصور میں نہیں سما سکتی''۔ [1]

یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں پیغمبروں، انبیائے کرام اور صوفیائے کرام نے انسان کو خدا کا راستہ دکھایا ہے۔ انہوں نے انسان کو خدا کے فیضان خیز اور پُر اثر تصورات دیے ہیں۔ وہ خدا کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ الوہی دنیا سے مضبوط روابط رکھتے تھے۔ انہیں خدا نے یہ قدرت دی تھی کہ وہ انسان کو، اُس کی اپنی زبان میں، خدا کی ہستی کا راز بتائیں۔

اِن برگزیدہ ہستیوں کے فراہم کردہ تصورات عام انسانوں کے قائم کردہ خدائی تصورات سے عظیم و بلند تھے۔ اس لیئے صوفی تحریک کی پہلی دُعا صوم کچھ یوں شروع ہوتی ہے:

''تعریف اُس ذات کی جو سب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔
خدا قادرِ مطلق، ہر جگہ موجود اور لامحدود اختیارات کا مالک ہے۔
وہی ایک ہستی ہے جو واجب الوجود ہے''۔

جیسا کہ انسان محدود قوت کا حامل ہے۔۔ خدا لامحدود طاقت اور اختیارات رکھتا ہے۔ انسان ایک وقت میں ایک جگہ پر موجود رہ سکتا ہے۔۔ اس کے برعکس خدا حاضر ناظر ہے۔۔ ہر جگہ موجود ہے۔ اُس کے لئے ہر مقام ''یہاں'' ہے۔ اس طرح دنیا کے قدیم ترین مذہبی صحیفے بھگوت گیتا میں ہم پڑھتے ہیں:

''تو انسانی پیمانوں سے ماورا اور بلند عظیم ترین ہستی ہے۔ انسان کا مستقل سہارا جو ہر وقت اُسے مضبوط رکھتا ہے۔ تو زندگی کے ابدی قانون کا محافظ ہے۔۔ تو زندگی کی لافانی روح ہے۔ نہ تو جنم لیتا ہے اور نہ ہی تجھے موت آتی ہے۔ تو لامحدود قوت کا حامل ہے۔ آسمان اور زمین تمہارے ہی نور سے منور ہیں۔ ان سب میں تو ہی بھرا ہوا ہے۔ اور یہ سب تیرے اندر وجود رکھتے ہیں۔ تو ہستی کا سب سے بڑا راز ہے۔ تیرے جلال و جمال نے ہر چیز پر کپکپی طاری کر رکھی ہے''۔ [2]

Marfat.com

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی کئی پہلو ایسے ہیں جو انسانی حدود سے برعکس ہیں۔ مثال کے طور پر ''مستقل سہارا'' جبکہ تمام دنیوی سہارے عارضی اور غیر مستقل ہیں۔ ''زندگی کے ابدی قانون کا محافظ'' جبکہ دنیوی قوانین تبدیل اور ختم ہو جاتے ہیں۔ ''نہ تو جنم لیتا ہے اور نہ ہی تجھے موت آتی ہے''۔۔ جبکہ انسان فانی ہے اور وہ پیدا ہوتا اور مرتا ہے۔

بھگوت گیتا کا مندرجہ بالا اقتباس نہایت شاعرانہ جمالیاتی واردات کا آئینہ دار ہے۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل اقتباس مہر پرستی کی یاد تازہ کرتا ہے:

''فرض کیجیے آسمان پر ایک ہزار سورج طلوع ہوئے ہیں۔۔ لامحدود اور نورانی خدا کی عظمت کا یہ عالم ہے''۔[3]

آخری اور جدید ترین مقدس کتاب قرآنِ کریم سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو!

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔
کہہ دو وہ خدا ہے۔۔ وہ ایک ہے۔ وہ مستقل اور مطلق ذات ہے۔ نہ اُس نے کسی سے جنم لیا ہے نہ ہی اُس نے کسی کو جنا۔ اور اُس کی مثل کوئی نہیں ہے''۔[4]

یہ تمام اوصاف ہمارے خدائی تصورات کو بلند کرتے ہیں کیونکہ اِن میں ایک ایسے خدا کا تصور سامنے آتا ہے جو انسانی تحدید سے ماوراو بلند ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ خدا اور ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ اِن مقدس کتب میں ملنے والے خدا کے تصورات تجریدی نوعیت کے حامل ہیں۔

دنیا بھر کے عظیم مذاہب میں بدھ مت سب سے زیادہ تصوراتی اور تجریدی مذہب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خدا کوئی ہستی۔۔ کوئی ذات نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔ لیکن یہ حقیقت، جو کہ ابدی ہے، جو خوشی کا باعث ہے۔۔ مجازی روپ دھارنا چاہتی۔۔ شعوری سطح پر ابھرنا چاہتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس اسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے:

''تمام دنیوی اشیا اور اُن کے مساکن تبدیلی کا رجحان رکھتے ہیں۔ فانی دنیا اُن اشیا سے پیدا ہوئی ہے جو پہلے موجود تھیں۔ تمام زندہ اجسام اپنے ماضی کے اعمال کا عکس ہیں۔ کیونکہ قانونِ علت و معلول غیر متبدل اور مستقل ہے۔ لیکن صداقت بدلتے ہوئے مظاہر میں مستور ہے۔
سچ اشیا کو حقیقت میں بدلتا ہے۔ سچ تبدیلی میں مستقل ہے۔ سچ ظاہر

Marfat.com

ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔سامنے آنا چاہتا ہے۔سچ شعور پانا چاہتا ہے۔
سچ اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہے۔ سچ پتھر میں موجود ہے۔ کیونکہ پتھر وجود رکھتا ہے اور کوئی طاقت اسے اس کے وجود سے محروم نہیں کر سکتی۔لیکن پتھر شعور نہیں رکھتا۔اس پودے میں سچ موجود ہے کیونکہ اس کی زندگی توسیع اور کشادگی کا رجحان رکھتی ہے۔پودہ پھولتا ہے۔۔ پھلتا ہے۔اس کا حسن حیران کن ہے لیکن یہ بھی شعور سے محروم ہے۔
سچ حیوانات میں موجود ہے۔یہ چلتے پھرتے اپنے ماحول کا ادراک رکھتے ہیں۔ یہ ذوق انتخاب کے حامل ہیں اور اشیا میں تفریق کر سکتے ہیں۔ یہ شعور رکھتے ہیں لیکن ان کا شعور سچ کا شعور نہیں ہے۔یہ صرف اپنی محدود ذات کا شعور رکھتے ہیں۔
محدود ذات کا شعور ذہن کی بصارت کو دھندلا کر کے سچ کو چھپا لیتا ہے۔
اور یہیں سے غلطی کا جنم ہوتا ہے۔یہیں سے واہمات جنم لیتے ہیں۔
اور یہی گناہ کا خمیر ہے۔
محدود ذات کا شعور خود غرضی پیدا کرتا ہے۔کوئی شر نہیں ہے سوائے اُس کے جو نفسِ خام سے جنم لے۔محدود ذات کے زور پر کیے گئے اعمال اور کہے گئے الفاظ کے علاوہ کچھ غلط نہیں ہے۔جنموں کے چکر میں دُکھ ہے، اذیت ہے۔لیکن سچ کے حصول سے حاصل ہونے والی خوشی کریم تر ہے۔
سچ متلاشی اذہان کو کیف و سرور سے متعارف کرواتا ہے۔سچ جھوٹ پر غالب آتا ہے۔یہ خواہشات کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے۔سچ نروان کا راستہ ہے''۔[5]

مندرجہ بالا اقتباس میں ایک بار پھر اشارہ ملتا ہے کہ حقیقت ظاہر ہونے کے لئے بیتاب ہے۔اور یہ حقیقت کیا ہے۔حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''خدا حقیقت ہے۔۔اور حقیقت خدا ہے''۔

لیکن خدا سے ذاتی تعلق استوار کرنے کے لئے خدا کے ذاتی تصور کی ضرورت ہے۔ تمام عظیم مذاہب میں اس کی واضح جھلک ملتی ہے۔مثال کے طور پر عہد نامہ عتیق میں خدا اور بنی اسرائیل کے درمیان رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ان مقدس کتب میں خدا سے محبت اور اُس کی مخلوق کی خدمت کا درس ملتا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس اس امر کی واضح مثال ہے۔

Marfat.com

"اے بنی اسرائیل خدا آپ سے کیا چاہتا ہے۔ اُس سے ڈرو۔ اُس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلو۔ اس سے محبت کرو۔ اس کی مخلوق کی خدمت کر کے اُس کی خدمت کرو۔

اُس کے قوانین کا احترام کرو۔ اُس کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کرو!

کیونکہ تمہارا خدا تمہارے دیوتاؤں کا خدا ہے۔ جس کے آگے کسی کی سفارش نہیں چلتی۔ کوئی انعام اُسے خرید نہیں سکتا۔ وہ یتیموں اور بے سہارا لوگوں کا سہارا ہے۔ وہ ہر شخص کو خوراک اور پناہ دے رہا ہے۔ اس لئے ہر اجنبی سے پیار کرو! وہ اُس کو بھی دیتا ہے جسے آپ نہیں جانتے۔

تم اپنے خدا سے ڈرو۔ اس کی مخلوق کی خدمت کرو۔ اُس سے مضبوطی سے جڑے رہو۔ اور اُس کے نام کی قسم کھاؤ"۔[6]

عہد نامہ جدید میں خدا کو آسمانی باپ کہا گیا ہے۔ اس مقدس صحیفے کے مطابق وہ ہماری خطاؤں کو جانچتا ہے اور ہمیں معاف فرماتا ہے۔ وہ پیدا کرنا والا رب ہے۔

اس طرح خدا کے کئی پہلو اور تصورات موجود ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو مختلف مذاہب میں موجود خدائی تصورات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ اور مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کی راہ میں حائل ہیں سطح بین عناصر اسی ظاہری صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر زمین پر بسنے والے انسانوں کے درمیان منافرت کی دیواریں کھڑی کرتے رہے ہیں۔ مذہبی غلط فہمیاں، کشمکش اور خدا کے نام پر لڑی جانے والی جنگیں اسی بنیادی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ ہر مذہب کا خدا مختلف ہے اور دوسرے مذہب کے خدا کا دشمن ہے۔ لیکن اگر ہم تمام مذاہب کی مقدس کتب کا بغور مطالعہ کریں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہر مقدس کتاب نہ صرف خدا کا تجریدی اور غیر شخصی تصور پیش کرتی ہے بلکہ شخصی و ذاتی تصور بھی سامنے لاتی ہے۔ اس طرح بھگوت گیتا اوپر بیان کردہ تجریدی بیان میں شخصی بیان کا اضافہ کرتی ہے۔

"اے مالک ہمارا سلام قبول ہو۔ تو بے پناہ طاقت رکھتا ہے اور تیری عظمت بے مثال ہے۔ جو کچھ ہے وہ تو ہے۔ کیونکہ کوئی مقام تجھ سے خالی نہیں ہے۔

میں تمہیں کرشن اور اپنا دوست کہہ سکتا ہوں۔ میں لافانی خدا کو اپنا دوست مان سکتا ہوں۔ یہ تغافل میری محبت کی پیداوار ہے اور میں تمہاری رفعتوں کو بھول کر تمہیں محبوب مانتا ہوں۔

Marfat.com

میں تجھے ہر جگہ اپنے ساتھ پاتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ اٹھتا ہوں۔۔
کھاتا ہوں۔۔ پیتا ہوں۔ یہ گستاخی، یہ بے ادبی معاف ہو۔
تو صانع ہے۔۔حرکت دینے والا مستقل خدا! صرف تو ہی ہمارا معبود ہو سکتا ہے۔۔تو عظیم ہے۔۔ بلند ترین حقیقت ہے۔ ان تین دنیاؤں میں تمہارا ہم سر نہیں مل سکتا۔
اس لئے میں تیرے حضور سر بسجود ہوں۔ اور تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔
مجھے معاف فرماؤ۔ جس طرح ایک سچا دوست ایک گستاخ دوست کو معاف کر دیتا ہے۔ باپ بیٹے کو معاف فرماتا ہے اور انسان اپنے محبوب کی خطائیں معاف کر دیتا ہے"۔7

دوسری طرف عہد نامہ جدید، خدا کے شخصی و ذاتی تصور کے ساتھ ساتھ، تجریدی اور صوفیانہ تصور پیش کرتا ہے۔

"In Him we live and move and have our being"

"اُسی میں ہم قیام کرتے ہیں۔۔ چلتے پھرتے ہیں اور وجود رکھتے ہیں"۔

2۔خدائی تصور کا ارتقاء:

اس سے ظاہر ہے کہ ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کونسا مذہب خدا کا درست تصور دیتا ہے اور کونسا غلط۔ تمام مذاہب خدائی تصورات پیش کرنے کے لئے انسانی زبان کا سہارا لیتے ہیں اور انسانی زبان میں خیالات و تصورات کی ترسیل میں سہو وخطا کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ الفاظ ذہن سے مخاطب ہوتے ہیں اور اُس ذات کی حقیقت اذہان اور الفاظ سے بلند اور لطیف تر ہے۔ کیونکہ ہر لفظ کسی نہ کسی مادی تصور سے جڑا ہوتا ہے اور وہ ذات غیر مادی حقیقت ہے۔ خدا ایک راز ہے۔ اس کے باوجود ہمارے لئے اُس کا کوئی نہ کوئی تصور قائم کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اِس تصور کے بغیر ہم خدا سے تعلق قائم نہیں کر سکتے۔ ہم خدا کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کر کے اُس کا ایک تکاملی تصور قائم کر سکتے ہیں۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت عنایت خانؒ ارتقائی خدائی تصور (God-ideal) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے مراد خدا کا ایسا تصور ہے جو ہر شخص اپنی ذہنی وتخیلاتی بساط کے مطابق قائم کر کے اُس ذات کے ساتھ ذاتی تعلق کا آغاز کرتا ہے اور یہ شخصی تصور آخر کار خالص تجریدی تصور کو جنم دیتا ہے۔ خدا کا یہ تصور اس لئے فیضان خیز ہے

Marfat.com

کہ ہر شخص اپنے محبوب تصور سے اُس ہستی کے تصور کو کشید کر سکتا ہے۔ خدا کا یہ تصور خدا کی حقیقت کا مکمل آئینہ دار نہیں ہے۔ یہ ایک انسانی تصور ہے۔ اس لئے مختلف انسانوں کے نزدیک یہ تصور مختلف ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ادراک اور علم کی توسیع کے ساتھ یہ تصور بھی ارتقاء پذیر رہتا ہے۔

حضرت عنایت خانؒ اس ارتقاء پذیر تصور کو سیڑھی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہمیں ہر قدم پر خدا کا قرب حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح ہم خدا سے اٹوٹ رشتہ استوار کر لیتے ہیں جو ہر قدم پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ رشتہ ہماری روح میں ایک روحانی گونج کو بیدار کرتا ہے اور یہی باطنی زندگی کا پہلا قدم ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

> ''روحانی راہ کا پہلا قدم خدا سے رشتہ استوار کرنا ہے۔ خدا کو ایک حقیقی معروض بنانا ہے۔ وہ خالق، رب، معاف کرنے والا، جانچنے والا، دوست اور محبوب ہوسکتا ہے ۔ ہم خدا سے کوئی بھی رشتہ استوار کریں۔۔ ہمیں ذاتی مشیت کی بجائے اُس کی مشیت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ ہمیں ہوائے نفسانی کو مشیت ربانی پر قربان کرنا ہے۔ ہمیں اس رشتے کو اس قدر حقیقی بنانا ہے کہ اُس ذات سے رشتہ محض تصوراتی رشتہ نہ رہے بلکہ سب سے حقیقی رشتہ بن جائے''۔[8]

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''باطنی زندگی کا مقصود و منتہیٰ اُسے اپنی زندگیوں کی اہم ترین حقیقت بنانا ہے۔ تاکہ وہ ذات صرف ایک تصور نہ رہے۔ یہاں تک کہ اُس کے ساتھ قائم کردہ رشتہ ایک انسان کو باقی تمام رشتوں سے اہم اور مقدم لگنے لگے''۔[9]

یہی صوفی کا مقصود ہے۔ اُس کے نزدیک خدا کے علاوہ کچھ بھی حقیقی نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں، جب ہماری تمام تر توجہ خارجی دنیا پر مرکوز ہے اور ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم زمین پر صرف خرید و فروخت کے لئے آئے ہیں، ہم تصوف کی راہ کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟

یہ سب سے اہم سوال ہے کیونکہ آج کے سائنسی دور میں لوگ خدا کے روایتی تصورات کو تخیلاتی آوارہ گردی کے ثمرات قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خدا انسان کے گھڑے ہوئے

Marfat.com

تصور سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کا روایتی تصور، جس کے مطابق وہ آسمانوں پر ایک تخت پر بیٹھا حکم چلا رہا ہے، تخلیق کے سائنسی تصورات سے میل نہیں کھاتا۔

اس لئے ہم سائنسی نظریات سے واقف ہوتے ہوئے خدا کا ایسا تصور کس طرح قائم کر سکتے ہیں جو جدید علمی معیارات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ جدید دور کی غیر لچکدار سائنسیت کے برعکس عصر حاضر کی سائنس زندگی اور توانائی کی ہمہ جائیت کی قائل ہے۔یہ زندگی اور توانائی علیم و فہیم ہے جسے مذاہب نے خدا کا نام دیا ہے۔حیات اور توانائی کی یہ تصویر عہد نامہ جدید کی اس آیہ کریمہ کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

''اُسی میں ہم قیام کرتے ہیں۔۔چلتے پھرتے ہیں اور وجود رکھتے ہیں''۔

تاہم خدا کا سائنسی اور فلسفیانہ تصور انتہائی تجریدی تصور ہونے کی بنا پر ہمارے دل میں اُس کی محبت بیدار کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ان تصورات کی بنیاد پر ہم خدا سے ذاتی تعلق استوار نہیں کر سکتے۔عالمگیر صوفی تحریک کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ حضرت عنایت خانؒ کے افکار حقیقت کے فلسفیانہ اور سائنسی تصور اور خدا کے ذاتی تصور کے درمیان حائل خلیج پر پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔

حضرت عنایت خانؒ خدا کے فلسفیانہ اور صوفیانہ تصور کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ حضرت اپنی مشہور کتاب *Unity of Religious Ideals* میں فرماتے ہیں کہ خدا کا ذاتی تصور قائم کئے بغیر روحانی ارتقاء ناممکن ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جن کا مطالعہ وسیع ہے اور جنہوں نے روحانی مسائل پر غور و فکر کیا ہے''سچ کو ہضم کئے بغیر اُسے چکھ چکے ہیں''۔10

اس کا کیا مطلب ہے۔ سچ کو ہضم کرنے کا مطلب ہے''سچ کو اپنی ہستی کا حصہ بنانا''۔سچ کا جاننا اور سچ ہو جانا دو مختلف باتیں ہیں۔جب تک ہم سچ کو جزو ہستی نہیں بنا لیتے ہماری زندگی بے معنی رہتی ہے۔محض فلسفیانہ اور تجریدی موضوعات کی تفہیم سے بات نہیں بنتی۔ سچ کو زندگی بنانا پڑتا ہے۔سچ کو جزو بدن۔۔جزوِ اعمال بنانا پڑتا ہے۔سائنس اور فلسفہ محض جانکاری ہے سچ ہونا نہیں۔

باطنی زندگی کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ ہم حقیقت سے رشتہ قائم اور زندہ رکھیں۔صرف اسی صورت میں ہم مشیت خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی شرط پر پورا اتر سکتے ہیں۔ہم اُس کے سامنے جھک سکتے ہیں۔ہم حدود فراموش اور بحر آسا شعور میں داخل ہو سکتے ہیں۔یہ حقیقت کی

Marfat.com

خشک جانکاری کی نسبت ایک گہرا تجربہ ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''خدا کی عبادت میں لطف اُس وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب ہم اُس کا ذاتی تصور رکھتے ہوں۔ اس کا ذاتی تصور قائم کرنے کے بعد ہمیں اپنی روح کو اجازت دینی چاہیے کہ وہ خدا کے تجریدی پہلوؤں کو رفتہ رفتہ بے نقاب کرے۔ خدا کا تجریدی تصور سکون اور طمانیت دیتا ہے۔ لیکن یہ اُس وقت سامنے آتا ہے جب ہم خدا کا ذاتی تصور قائم کرنے کے بعد اُس کی عبادت کا حق ادا کر چکے ہوتے ہیں''۔[11]

لیکن آج کے سائنسی دور میں ہمارے سامنے کچھ بنیادی سوال بدستور موجود ہیں۔ سائنس نے ہمیں حقیقت کا انتہائی تجریدی تصور دیا ہے۔ اس صورتِ حال میں ہم اپنے دل میں خدا کی محبت کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ کیونکہ اُس ذات کی محبت دل میں پیدا کئے بغیر انسان کا روحانی و اخلاقی ارتقاء ناممکن ہے۔ حضرت عنایت خان Unity of Religious Ideals میں فرماتے ہیں:

''اگر خدا شخصیت کا حامل نہیں ہے۔۔ تو ہم انسان جو اُس خورشید کی کرن ہیں۔۔ جن کے اندر اُس کی پھونکی ہوئی روح ہے۔ ہم کہ جن کی روح اُس کی تکمیل و اتمام کی ایک جھلک ہے شخصیت کیوں رکھتے ہیں؟''۔[12]

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''اگر بلبلہ پانی ہے۔۔ سمندر بھی پانی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بلبلہ پانی ہو لیکن سمندر نہ ہو؟ خدا سمندر ہے تو انسان اسی سمندر کی ایک بوند ہے۔ بوند سمندر سے بہت چھوٹی ہے۔ بہت چھوٹی! لیکن یہ بھی وہی کچھ ہے جو کچھ سمندر ہے۔ اگر بوند شخصی انفرادیت کی حامل ہے۔ شخصیت رکھتی ہے۔ تو سمندر بھی شخصیت کا حامل کیوں نہیں ہو سکتا۔ اگر اُس سمندر کی بوند قوتِ ادراک سے لیس ہے۔ محسوسات اور جذبات رکھتی ہے۔ شعورِ ذات رکھتی ہے۔ سمندر کس قدر محسوسات، جذبات اور قوتِ ادراک رکھتا ہوگا''۔[13-14]

3۔انسان اور خدا:

دیکھیں کس طرح حضرت عنایت خانؒ نے خدا کے تجریدی اور ذاتی تصور کو یکجا کر دیا ہے۔اس طرح ہمارے سامنے خدا کا ایک فیضان انگیز تصور ابھرتا ہے۔ایک طرف وہ ایک ایسی ہستی ہے جو ہر چیز میں جاری وساری روح ہے۔دوسری طرف وہ ایک مکمل شخصیت ہے۔ایک کامل ذہن اور تمام مخلوق کا رہنما ہے جو انفرادی سطح پر بھی مخلوق کی رہنمائی کر رہا ہے۔اگر اُس سے ہمارا رشتہ بوند اور سمندر کا ہے تو وہ سب شخصیات کا مجموعہ ہے۔اُس کے اندر رہتے ہوئے کوئی وہ کچھ ہو سکتا ہے جو کچھ ہونے کا امکان موجود ہے۔اس لئے ہمارے اور خدا کے مابین ذاتی تعلق موجود ہے۔یہ تخیلاتی رشتہ نہیں ہے۔یہ حقیقی رشتہ ہے جو ہماری زندگیوں کا سائبان ہے۔

آج ہم پر مادہ پرستی کی مستی چھائی ہے اور ہم نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔اگر ہم اپنی آنکھیں کھولیں اور زندگی کا گہرا مشاہدہ کریں۔زندگی کی آواز پر کان دھریں اور جاننے کی کوشش کریں کہ زندگی ہمیں کیا کہہ رہی ہے۔اگر ہم یہ دیکھ پائیں تو ہم جان پائیں گے کہ ایک ہستی ہر انداز سے ہماری رہنمائی فرما رہی ہے۔ہم اس رہنمائی کو بہت سے لطیف راستوں سے اپنے تک پہنچتا دیکھ سکتے ہیں۔اگر ہم اپنے ذہن کا منہ زور گھوڑا لگام کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اُس کی آواز براہِ راست سن سکتے ہیں۔لیکن اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے یہ آواز خارجی دنیا سے آتی محسوس ہوتی ہے۔کبھی فطرت کی کسی نشانی کی صورت میں۔یا کسی علامتی خواب کی صورت میں وہ ہم تک اپنا پیغام بھیج رہا ہے۔اگر اس کے باوجود بھی ہم اپنی آنکھیں بند رکھیں۔۔کوئی المناک واقعہ۔۔کوئی تجربہ ہماری آنکھیں کھول دے گا۔ہمارے اعمال کے نتائج ہماری طرف لوٹتے ہیں۔اس طرح ہمارے سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔

یہ دیکھنا۔۔یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ وہ ذات کس طرح ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ خدا سے انسان کے اس تعلق پر روشنی ڈالنے کے لئے حضرت عنایت خانؒ ماں اور بیٹے کی مثال دیا کرتے تھے۔بچہ آزادی سے دوڑنا چاہتا ہے۔وہ تمام حدیں پھلانگنا چاہتا ہے۔ماں اُسے جانے دیتی ہے لیکن اُس پر نظر رکھتی ہے۔وہ چاہتی ہے کہ اُس کا بچہ زندگی کے تجربے سے گذرے لیکن خاردار راہوں سے بچا رہے۔بالکل اسی طرح اگر ہم آنکھیں کھول کر دیکھیں تو اُس ذات کی رہنمائی ہمیں میسر ہے۔

Marfat.com

اس طرح ہم خدا سے وہ ذاتی رشتہ قائم کر سکتے ہیں جو روحانی ارتقاء کی پہلی شرط ہے۔ اس کے بعد ہم اس رشتے کو ایک زندہ جاوید حقیقت میں ڈھال سکتے ہیں۔ بعدازاں ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں اِس عمیق رشتے کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ اگر ہم خدا اور انسان کے مابین رشتوں کا کھوج لگالیں تو ہماری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوگا۔ ہم پہلے سے زیادہ مضبوطی اور آزادی کا تجربہ کریں گے۔ اُس ذات سے قائم شدہ تعلق ہمیں وہ دولت عطا کرے گا جو ہم سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ یہ رشتہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمارا سہارا بنے گا۔ اُس کی مشیت کے آگے جھک جانے سے ہم خدائی طاقت سے بھر جائیں گے۔ اس مقام پر ہم اس عظیم روحانی راز سے واقف ہونگے کہ "اُس ذات کے آگے جھک جانا ہی اصل طاقت کا اظہار ہے"۔

اگر آپ کی آنکھ کھل گئی اور آپ نے دیکھ لیا کہ خدا زندگی کے ہر میدان میں آپ کا مددگار ہے تو آپ کے دل میں اُس کی محبت کی رس دھار بہہ نکلے گی۔ اور آپ کی زندگیاں بامعنی ہو جائیں گے۔

4۔ وحدتِ ادیان:

خدا کا ذاتی تصور قائم کرتے ہی ہم یہ جاننے لگتے ہیں کہ دنیا کے تمام عظیم مذاہب کسی ایک سچائی کا درس دیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے ہاں خدا اُس کی محبوب ترین ہستی کا عکس ہے۔ ہر شخص اُسے اپنی ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر کلچر ہر تہذیب اُسے اپنے مخصوص رنگ میں دیکھتی ہے اس لئے اُس ذات کے مختلف تصورات جنم لیتے ہیں۔ ہر مذہب کی مقدس کتب میں اُس کو بیان کرنے کے لئے وہی الفاظ استعمال کئے گئے جو اُس زبان کو سمجھنے والے لوگوں کے لئے جانے پہچانے تصورات کی ترسیل ممکن بناتے تھے۔ ان تصورات میں ظاہری فرق ضرور ہوتا ہے لیکن اشارہ ایک ہی ہستی کی جانب ہوتا ہے۔

حضرت عنایت خانؒ نے ہمیں بتایا ہے کہ جب بھی انسان صراطِ مستقیم سے ہٹا ہے تو اُس کی رہنمائی کے لئے خدا نے پیغمبر بھیجے ہیں۔ جب بھی ایک مددگار اور مامتا صفت خدا کا تصور توہم پرستانہ عقائد نے دھندلا دیا تو خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ پیغمبر بھیجے گئے جنہوں نے جہالت کے اندھیروں کو رفع کیا اور انسان کو دنیوی زبان میں خدا سے آشنا کیا۔ انہوں نے انسانوں کی نظر بلند کی اور اُنہیں ایک بلند و بالا ہستی سے متعارف کروایا۔ خدا کے ان پیامبروں نے

Marfat.com

انسانیت کے لئے مقدس صحائف چھوڑے جن سے آج کا انسان بھی ہدایت پا سکتا ہے۔

آج کے دور میں، جب نقل و حمل کے ذرائع اور دیگر سہولیات نے مختلف مذاہب کے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ لوگ دنیا بھر کے مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور وحدت کے راز کو پا سکیں۔

جس طرح خدا ایک ہے۔۔اُس کا پیغام بھی ایک ہے۔ ہر مذہب خدا کی مخلوق کی خدمت اور اُس کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا درس دیتا ہے۔ تمام مذاہب کا درس عالمگیر اخوت ہے۔ تمام مذاہب نے خدا کی مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے۔ تمام مذاہب منجانب اللہ ہیں۔ اللہ نہ صرف انصاف کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ خود سب سے بڑا منصف ہے۔ اُس کی ہدایت سب کے لئے ہے۔

اسی درس کو عام کرنے کے لئے حضرت عنایت خانؒ نے عالمگیر عبادت کا تصور دیا ہے۔ یہ عبادت اس بات کی علامت ہے کہ نورِ ازلی کس طرح تمام انسانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس عبادت کے دوران ایک روشنی سے ہر مذہب کی ایک شمع روشن کی جاتی ہے۔ اور یہ ایک روشنی نورِ ازلی کی علامت ہے جو سب کو ہدایت دے رہا ہے۔

اس عبادت کے دوران عظیم مذہبی صحائف اور کتب سے اقتباسات کی تلاوت اور ان کے موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے۔ عالمگیر عبادت میں امامت کے فرائض کوئی پیشہ ور پادری یا خطیب ادا نہیں کرتا بلکہ صوفی تحریک کا ہر ممبر یہ فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ اس عبادت میں عورتیں اور مرد یکساں شرکت کرتے ہیں۔ اس طرح عالمگیر عبادت میں ہر مذہب کے ماننے والے شرکت کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک کو دوسرے کے مذہب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور لسانی گورکھ دھندے سے پہلو بچا کر وحدت اور اتحاد کا درس پانے کا موقع ملتا ہے۔ اس وقت عالمگیر عبادت کا اہتمام دنیا بھر میں صوفی تحریک کے مراکز میں کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر یہ جاننا ضروری ہے عالمگیر عبادت کا مقصد دنیا بھر کے مذاہب کو قریب لانا ہے نیا مذہب متعارف کروانا نہیں۔ یہ وحدت کے صوفیانہ شعور کی علامتی شکل ہے۔ صوفیانہ شعور جو ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ''سب ایک ہے۔ ایک سب ہے''۔ جب حضرت عنایت خانؒ دنیا کے مشترکہ مذہب کی بات کی تو اُن کی مراد رسم پرستی، کور چشم عقیدہ پسندی یا خدا کے کسی مخصوص تصور یا نام کی اجارہ داری نہیں بلکہ انسان کے دل و دماغ اور کردار میں خدائی خلوص کو جنم دینا تھا۔

یہ خدائی خلوص کیسے حاصل ہوتا ہے؟ ہندو اس منزل کے حصول کے راستے کو دھرم کہتے ہیں جس کا مطلب خدمت، فرض یا وہ قانون ہے جس کی پیروی اس کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ راستہ خدمت اور فرض سے عظیم تر ہے۔ ہم اسے احترامِ ہستی کا راستہ کہہ سکتے ہیں۔ جب ایک شخص احساس کی دولت سے مالا مال ہو۔ وہ اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایسا شخص اپنی فرض شناسی سے زندگی کے معنی کشید کر سکتا ہے۔

حضرت عنایت خانؒ کے نزدیک انسان کا مشترکہ مذہب ماضی کے تمام مذاہب کا نچوڑ ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے دل میں یہ احساس جگانے کی کوشش کی کہ زندگی ایک فرض ہے۔ لہٰذا یہ بات اہم نہیں ہے کہ ہم عبادت کی غرض سے کس عمارت میں جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر پل اس پر مذہبی فریضہ عائد کرتا ہے۔ کوئی ایسا مذہب نہیں جس پر ایک انسان یقین رکھتا ہے۔۔ بلکہ مذہب وہ ہے جس میں انسان رہتا ہے۔

تصوف کا پیغام کیا ہے؟ تصوف باطن میں زندگی کا سراغ پانے کا نام ہے۔ وہ زندگی جسے ہم نے مادہ پرستی کے جنون میں بھلا کر رکھ دیا ہے۔ تصوف دل کو زندہ کرنے کا نام ہے۔ انسان کا دل اُس وقت زندہ ہوتا ہے جب اِس میں محبت جاگتی ہے۔ رحم دلی، دوستی، ہمدردی، تحمل، برداشت، عفو و درگذر سب اعلیٰ اوصاف دل کے زندہ ہونے سے مشروط ہیں۔ دل ان عظیم جذبات کا ایسا سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ ایک دفعہ دل سے محبت کا چشمہ پھوٹ پڑے۔۔ انسان جو کچھ کرے، جو بولے، جو سنے سب مذہب ہے۔ محبت کرنے والا انسان ہی حقیقت میں مذہبی انسان ہے۔ دنیا میں کوئی نیا مذہب نہیں آئے گا۔ کیونکہ تمام مذاہب دل کو زندہ کرنے کا درس دیتے تھے۔ تمام مذاہب دل کے مذہب تھے۔ انسان کو محبت سکھاتے تھے۔[15]

Marfat.com

باب 8

تصوف، وصلِ خداوندی کا راستہ

1۔صوفیانہ واردات:

گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ ہم خدا سے رشتہ کیسے جوڑ سکتے ہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ہماری روحانی بلندی اور دنیوی سرفرازیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں سب سے اہم مرحلہ اُس کا تصور قائم کرنا ہے۔ یہ تصور ہمارے لئے اُس تک پہنچنے کے لئے زینے کا کام دے سکتا ہے۔ ہم اس زینے پر پاؤں پاؤں چڑھتے ہوئے اُس کے قرب کا شرف پا سکتے ہیں۔ اس زینے پر چڑھ کر۔۔اُس کا قرب حاصل کر کے بلند سے بلندتر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک دن۔۔کسی کریم لمحے میں۔۔اپنی ذات کا شعور پا کر ہم اُسے جان لیتے ہیں۔

اس طرح ہم خداوندِ کریم سے زندہ رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہم اُس سے مانگ کر۔دُعا کے ذریعے۔۔اُس سے مدد مانگ کر اس رشتے کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس رشتے کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو ایک دن وہ ہمیں ہر جاندار اور غیر جاندار میں بجھائی دینے لگے گا۔ ہم جان لیں گے کہ کچھ بھی اُس سے خالی نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ برابر موجود ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ نہیں ہے۔ ہم جان لیں گے کہ وہ زندگی ہے اور حیات اُسی سے پھوٹتی ہے کیونکہ وہ سرچشمۂ حیات ہے۔ خدا سے محبت ہمیں بصیرت عطا کرتی ہے۔ بصیرت دل کی آنکھ ہے۔ جس کی مدد سے ہم دائمی تخلیقی عمل میں اُس کا ہاتھ دیکھ پاتے ہیں۔ اگر ایک بار یہ دکھائی دینے لگے کہ سب کچھ وہی کر رہا ہے۔ انسان محض وسیلہ ہے۔۔سمجھ لیجئے کہ آپ کے اندر بھی ولایت کا پھول کھلنے والا ہے۔

تاہم ایک صوفی اس مقام سے بھی آگے جانا چاہتا ہے۔ وہ خدا کا تجربہ چاہتا ہے۔ وہ مظاہراتی ہیولوں کے پار حقیقت میں ڈوب کر حقیقت ہونا چاہتا ہے۔ جب تک مذہب محض عقیدہ پرستی اور رسومات کی بجا آوری کا نام ہے۔۔ وہاں خدا اور بندے کے درمیان اناپ خلیج حائل کردی گئی ہے۔ لیکن تصوف، جسے حضرت عنایت خانؒ نے روح الادیان کہا ہے، خدا اور بندے کے درمیان اس اناپ خلیج کا قائل نہیں ہے۔ صوفی اپنی محدود مادی ذات سے نکل کر خدا کی بحر آسا ذات کا گیان چاہتا ہے۔ صوفی وصلِ خداوندی سے زیادہ اور کم کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔ وہ اُس سمندر میں فنا ہو کر کلی شعور چاہتا ہے۔ وہ نفسِ کثیف سے ماورا ہو کر خالص شعور کا کھوج لگانا چاہتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اس مقام کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

''اس مقام پر پہنچ کر صوفی گوشِ کریمی سے سنتا ہے۔۔ اُس کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اُس کے ہاتھوں سے کام کرتا ہے۔ اُس کے قدموں سے چلتا ہے۔ اس طرح اس کی فکر فکرِ خداوندی کا درجہ پالیتی ہے۔ اُس کا احساس احساسِ ربانی کہلاتا ہے۔ ولیِ کامل کے نزدیک عابد اور معبود۔۔ شاہد اور شہود۔۔ طالب اور مطلوب۔۔ عاشق اور معشوق کے درمیان بھید اور تفریق فریب ہے، واہمہ ہے، سراب ہے۔ جیسا کہ عظیم فارسی شاعر خسرو نے کہا ہے:

''جب میں تو ہو گیا۔۔ اور تو میں ہو گیا
جب میں جسم اور تو روح ثابت ہوا!
تو عشق، عاشق اور معشوق میں فرق مٹ گیا''۔[1]

صوفی پہلے پہل خدا کو باہر تلاش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے ذہن میں ابھرنے والا خدا کا اوّلین تصور بھی کسی خارجی ہستی سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن اُسے خدا اُس وقت ملتا ہے جب وہ دُرون بینی پر انحصار کرتا ہے اور وہ اُسے پالیتا ہے۔ اُس لمحے وہ جان لیتا ہے کہ وہ خوشبو، جو اُسے باہر سے آتی محسوس ہوتی تھی، دراصل اُس کے باطن سے اٹھ رہی تھی۔ خدا تو اُس کے اندر مقیم تھا۔۔ روح کی صورت میں۔ زندگی کے روپ میں۔ حضرت عنایت خانؒ یہ راز خالص شاعرانہ انداز میں فاش کررہے ہیں:

''میں تجھے ڈھونڈتا رہا، لیکن نہ پاسکا۔ میں نے باآوازِ بلند تجھے پکارا۔ میں نے بلند میناروں پر کھڑے ہو کر تمہیں صدائیں دیں۔ میں طلوعِ آفتاب

Marfat.com

سے غروبِ آفتاب تک مندر کی گھنٹیاں بجاتا رہا۔ میں بے سود گنگا کے پانیوں میں اشنان کرتا رہا۔ میں کعبہ سے مایوس لوٹ آیا۔ میں نے تمہیں زمین پر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے تجھے آسمانوں میں ڈھونڈا۔ لیکن آخر کار میں نے تجھے اپنے دل میں دھڑکتا پایا''۔[2]

صوفیانہ واردات کا لفظوں میں بیان ممکن نہیں۔ کیونکہ روحانی تجربہ بے نظیر اور بے مثل ہے۔ آپ بغرضِ ابلاغ مثال کہاں سے لائیں گے۔ یہ تجربہ کوئی خارجی تجربہ نہیں ہے۔ کیونکہ نہ اس تجربے کی نوعیت ذہنی ہے اور نہ ہی جسمانی۔ یہ روحانی نوعیت کا باطنی تجربہ ہے۔ روح شیشے کی طرح شفاف ہے۔ اگر اس شیشے کا ایک رخ ڈھانپ دیا جائے تو یہ آئینہ بن جاتا ہے جس میں ہم اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ جب روح آئینہ ہو جاتی ہے تو اس میں خارجی تجربات کا عکس پڑتا ہے۔ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ خارجی علم رکھنے والا ہر شخص باطنی علم سے بھی مالا مال ہو۔ باطنی علم کے حصول کے قابل بنانے کے لئے صوفیائے کرام روح کے شیشے کا خارجی رخ ڈھانپ دیتے ہیں۔ تا کہ شیشہ آئینہ بن جائے اور داخلی دنیا کا عکس دکھائے۔ جونہی کوئی شخص روح کے شیشے کا خارجی رخ ڈھانپنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔۔ باطنی رازوں سے پردے اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں''۔[3]

مختلف صوفیائے کرام نے، اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں، اس مقام کو اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ:

''انسان خالی جام کی مانند ہو جائے۔۔ تا کہ اس میں نورِ ازلی کی شراب انڈیلی جا سکے''۔

شیشہ، آئینہ، خالی جام اور شراب کے استعارے اس بات کا ثبوت ہیں کہ صوفیانہ تجربہ، بے مثل اور بے نظیر تجربہ ہونے کی وجہ سے، ماورائے کلام ہے۔ روحانی تجربہ روح کا انفرادی تجربہ ہے جس میں کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ روحانی واردات شعورِ خالص میں قیام کا نام ہے۔ اس تجربے کے بغیر تکمیل ممکن نہیں۔ یہ وجد آور بیہوشی کا تجربہ ہے جس کے دوران انسان مکمل طور پر ہوش میں رہتا ہے۔ یہ بے حجاب ذات سے وصال کا تجربہ ہے اور اس کے بغیر علوم و دانش کا جنم ممکن نہیں۔ اس الوہی تجربے کے بعد:

''ہستی کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ بھوک مٹ جاتی ہے۔ ہستی کے مرکزے کو چھونے کے بعد وہ جانکاری حاصل ہوتی ہے جس کا الفاظ میں بیان

Marfat.com

> ناممکن ہے۔ کیونکہ حقیقتِ واحدہ تحریر و تقریر اور زبان و بیان کی گرفت سے گریز کا رجحان رکھتی ہے۔ صوفیائے کرام نے اس جانکاری کو عرفانِ نفس کا نام دیا ہے جسے مذہبی لوگ خدائی شعور کہتے ہیں اور فلسفیانہ فکر رکھنے والے کائناتی شعور کہتے ہیں''۔[4]

حقیقتِ واحدہ کے ساتھ وصال و اتصال کا تجربہ ہونے کے ناطے تصوف ہر مذہب کی روح ہے۔ اس کے اصول و مبادی دنیا بھر کے متصوفین کے نزدیک یکساں ہیں۔ تصوف ہی وہ شیرازہ ہے جو تمام مذاہب کو وحدت عطا کر سکتا ہے۔ ہر جگہ، ہر مذہب میں تصوف کی بنیاد عشق پر ہے۔ اگر فرق ہے تو ظاہری اوضاع و رسوم کا ہے۔ لیکن سب کا مقصود اور داعیۂ باطنی ایک ہی ہے۔

دنیا کے مختلف مذاہب میں صوفیا کے طریقۂ کار کا فرق مذہبی شعائر و رسوم کے فرق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں یہ فرق محض خارجی ہے باطنی نہیں۔ مثال کے طور پر مشرق کے ہندو اور بدھ متصوفین کے ہاں سنیاس (ترکِ دنیا) کا درس موجود ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔ ہندو اور بدھ صوفیا نے صرف باطنی زندگی کو اہمیت دی ہے۔ تاہم اسلامی تصوف، جس کی تعلیم حضرت عنایت خانؒ نے دی ہے زندگی اور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

> ''صوفی وہ ہے جو زندگی کے خارجی اور باطنی پہلوؤں کے درمیان توازن پیدا کر لے''۔

لہٰذا دنیوی زندگی میں روح خارجی زندگی کی ذمہ داریاں نبھا کر آزمائش سے گذرتی ہے۔۔ اپنی ذمہ داریاں نبھاتی ہے اور زمین پر بسنے والے دوستوں سے ہمدردی کا رشتہ استوار کرتی ہے۔ دنیا جگاتی ہے۔ دنیا میں جاگے بغیر باطنی دنیائیں دریافت نہیں ہو سکتیں۔ دنیا ہمیں ہماری ذاتی حدود کی خبر دیتی ہے۔ اور ان حدود سے ماورا ہوئے بغیر ہم باطنی دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ باطنی زندگی ہماری خارجی زندگی میں توازن لاتی ہے۔ اس طرح زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی ہم آہنگی سے زندگی تکمیل پاتی ہے۔

اس طرح تصوف کے دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں:

1۔ روحانی تربیت۔ باطنی زندگی کا شعور پانا۔

2۔ تزکیہ۔

Marfat.com

2۔روحانی تربیت:

روحانی تربیت کا مقصد عرفانِ ذات ہے۔اپنی ہستی کا شعور پانا اس لئے مشکل ہے کیونکہ ہماری تمام تر توجہ زندگی کے خارجی پہلوؤں پر مرکوز ہے۔اور ہم اپنے ذہن اور جسم سے کام لے رہے ہیں۔زمین پر زندگی کے آغاز سے ہی ہم اپنے آپ کو ایک الگ تھلگ شخصیت سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ہم اِس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم ''دوسروں'' سے مختلف ہیں۔دنیا میں ہر کوئی ہمیں ہمارے نام سے پہچانتا ہے۔ہم کسی خاص مقام پر جنم لیتے ہیں۔ہمارے والدین ہماری تربیت کرتے ہیں۔اس طرح ہماری زندگیوں کا آغاز ہوتا ہےاور ہم انفرادی تجربات سے گذرتے ہیں۔

یہ تجربات ہمارے ذہنوں پر نقش ہو جاتے ہیں اور ہمارے افکار کو مختلف دھارناؤں میں لے کر جاتے ہیں۔انہی تجربات، نقوش اور تاثرات سے ہمارا کردار تشکیل پاتا ہے۔زندگی آگے بڑھتی ہےاور ہم مزید تجربات سے گذرتے ہیں جن سے گذشتہ افکار اور احساسات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔اس طرح ہمارا ذہن ہمارے لئے ایک مختلف اور الگ تھلگ دنیا تشکیل دیتا ہے۔اور ہم مخصوص خواہشات، مسائل اور مقاصد لے کر زندگی گذارنے لگتے ہیں۔رفتہ رفتہ ہم اپنے ذہن کی تشکیل کردہ اس دنیا کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو ذہن اور جسم ہی ماننے لگتے ہیں۔اور ہم اپنی حقیقت فراموش کر دیتے ہیں۔

حضرت عنایت خانؒ اس صورتِ حال کو واضح کرنے کے لئے ایک مسافر کی کہانی سناتے ہیں جو ایک گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔یہ مسافر گاڑی کی کھڑکی سے جھانکتا ہے۔تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے مناظر دیکھنے میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔گاڑی کی کھڑکی سے باہر نظر آنے والے مناظر خارجی دنیا کا مسحور کن واہمہ ہے۔ہم ان حسیات کی کھڑکیوں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ہمیں اِن کھڑکیوں اور محدود چوکھٹوں سے باہر نکلنا ہے تاکہ ہم حقیقی زندگی سے آشنا ہو سکیں۔اور آج تک ہم اُن شناختوں کی کھڑکیوں سے دیکھتے آئے ہیں جو سماج نے ہمیں دی ہیں۔جو پیدائش کے حادثے نے ہمیں عطا کی ہیں۔

تصوف کا بنیادی مقصد یہ بھی ہے۔ہم جان لیں کہ ہم کیا ہیں۔ہم ذات کی نظر سے دنیا کو دیکھنا شروع کر دیں۔تاہم یہ مقام صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص نہیں ہے جو صوفیانہ

Marfat.com

ریاضتوں میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ تقریباً ہر شخص کی زندگی میں یہ وقت ضرور آتا ہے جب خارجی زندگی اُسے اطمینان نہیں دے پاتی اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ زندگی سے چُوک گیا ہے۔ اُس کے دل میں گہری اور مکمل خوشی کی امنگ جاگتی ہے۔ وہ ایسی خوشی چاہتا ہے جس سے زندگی تکمیل پا سکے۔

حضرت عنایت خانؒ اسے ''روحانی بیداری کا وقت'' کہتے ہیں۔ اس مقام پر ہم واضح طور پر محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم جسم نہیں ہیں۔ تاہم یہ جسم ایک آلہ ہے جو ہمیں استعمال کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہم جسم نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اس بنیادی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے، کچھ دیر کے لئے، ذہن اور جسم کی سرگرمیوں کا انقطاع اور تعطل ضروری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن اور جسم پر کچھ دیر کے لئے جمود طاری کر دیں۔ کوئی موزوں آسن باندھ کر بیٹھ جائیں۔ جسم اور ذہن کو بالکل روک دیں۔ افکار و احساسات کی لہروں کو شعور کے سمندر پر دم توڑنے دیں۔ انہیں زبردستی باہر نہ نکالیں بلکہ اُن سے بے نیاز اور بے خبر ہو جائیں۔

جس حد تک ہم ذہن کو خاموش کرنے میں کامیاب ہونگے ہمارا باطنی تجربہ اُسی قدر گہرا ہوگا۔ خارجی دنیا کی ہر چیز سے ہمارا رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ اِس تجربے کا بیان ممکن نہیں۔ یہ اِس قدر لطیف ہے جیسے روشنی۔ اس سے مراد باطنی روشنی بھی ہے جو انسان کے حدود گرفتہ شعور کو بلندی عطا کرتی ہے۔ اور یہ روشنی سکون آور ابدی دنیا کی پہلی جھلک بھی ہے۔ اگر باطنی دنیا کی ایک جھلک نصیب ہو جائے۔۔ اگر یہ حقیقت ایک مرتبہ ہمارے شعور کو چھو لے تو گہرا سکون اور وجد آور خوشی انسان کا مقدر بن سکتی ہے۔

لیکن اس پر سکون خاموشی کا حصول بہت مشکل ہے۔ جونہی ہم آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں۔ ہر قسم کے افکار و خیالات ہمارے ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہم جان لیتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ ایک بے آرام اور سیماب صفت گھوڑا ہے۔ اس گھوڑے پر ہم سوار ہیں۔ لگام چھوٹ گئی ہے اور پاؤں رکاب سے باہر جھول رہے ہیں۔

اس مشکل پر قابو پانے کے لئے روحانی تربیت لازم ہے۔ اس تربیت میں پہلے پہل ہم ذہن کو زیر کرنے کا فن سیکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے صوفی سکولز ارتکاز اور استغراق کی مشقیں تجویز کرتے ہیں۔

Marfat.com

ارتکاز داخلی اور خارجی دنیاؤں میں کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ ہم دنیا میں بھی ارتکاز کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کچھ بھی پانے کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لئے توانائی اور توجہ اِس پر مرکوز رکھیں۔ جس قدر ہم کسی مقصد پر، دوسری چیزوں سے توجہ ہٹا کر، توجہ اور توانائی مرکوز کریں گے ہم اپنے کام میں اس قدر تخلیقی اور سریع الرفتار ہو پائیں گے۔ جب ہم کسی کام میں دلچسپی لے رہے ہوتے ہیں تو ارتکاز خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ارتکاز تمام دنیوی کامیابیوں کا راز ہے۔

روحانی دنیا میں ''شعوری ارتکاز'' (conscious concentration) کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی لئے اسے مشکل سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد ذہن کو تھامنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اپنے ذہن کو کسی علامت، تصویر یا معروض پر مرتکز کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے ذہن کو خاموش رہنے پر رضا مند کرتے ہیں۔

استغراق اگلا قدم ہے۔ اس مقام پر ہم اپنے ذہن کو کسی ایک فکر یا تصور میں غرق کر دیتے ہیں۔ یہ مشق ارتکاز کی نسبت زیادہ لطیف اور مہین ہے۔ اس مقام پر ذات میں گہرا اترنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفیانہ تربیت گاہوں میں انسان کی فکر کو تصورِ خداوندی میں غرق کرنے کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ خدا جو باطنی زندگی کی روشنی اور مغز ہے۔ جو حقیقة الحقائق ہے۔ استغراق کا مقصد اسی حقیقت سے اپنے آپ کو جوڑنا ہے۔ اسی مقام پر محدود لامحدود سے جڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری شخصیت میں خدائی صفات منعکس ہو سکتی ہیں اور اُس کا قرب اور اتصال نصیب ہو سکتا ہے۔ یہ مقام اُس الوہی مقام کی تیاری ہے جہاں انسان بچشمِ دل اُس کا دیدار کر سکے گا۔ اسی مقام پر روح خدا اور روح کے ہم جنس ہونے کا راز کھلتا ہے اور مغائرت رفع ہو جاتی ہے۔

خدائی صفات کے سمندر میں شعور کو غرق کرنے سے انسان پر اُس کی صفات کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اس طرح استغراق ہماری باطنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ تاہم تصوف میں روحانی تعلیمات و تربیت کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں ہم مرتبۂ تشبیہ سے نکل کر مرتبۂ تنزیہہ میں داخل ہوتے ہیں*۔

---

* مرتبۂ تشبیہ میں اسماء و صفات کو ذاتِ حق سے منسوب کیا جاتا ہے جو، صوفیائے کرام کے نزدیک، ذاتِ لامحدود کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ جبکہ مرتبۂ تنزیہہ وہ مرتبہ ہے جہاں ذاتِ حق کی تشبیہ ممکن نہیں اور وہ سرحدِ فہم و افہام سے ماوراء ہے۔ مترجم

Marfat.com

تشبیہات اور مماثلات کے جہان سے نکل کر ہی ہم یہ جان پاتے ہیں کہ وہ ذات شانِ اطلاق میں خالی از صفات ہے۔ اُس کی تشبیہ اور مثل ممکن ہی نہیں۔ وہ محض اُس وقت صاحبِ صفت کہلاتا ہے جب ہم اُسے مرتبۂ خالق میں دیکھتے ہیں۔ یہ کائنات شعاعوں کی مانند آفتابِ حقیقت سے صادر ہوئی ہے۔ اس مقام پر یہ راز بھی کھلتا ہے کہ کائنات بذات خود موجود نہیں ہے۔ اس کے موجود ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ ذاتِ حق کا مظہر ہے۔ اور اِس کی حقیقت وجود نہیں عدم ہے۔ صرف خدا کی حقیقت وجود ہے کیونکہ وہ ''موجودِ بالذات'' ہے۔ وہ واجب الوجود ہے جبکہ کائنات ممکن الوجود۔ یہیں پر یہ راز بھی کھلتا ہے ذہن اور جسم محض آلات ہیں۔ اور اِن کے ذریعے ذات خود آگہی چاہتی ہے۔ ہمارا جسم خُدا کا گھر ہے۔

صوفیانہ روایت میں مجاہدات و ریاضات مقدس الفاظ کے مسلسل ورد سے تکمیل پاتی ہیں۔ یہ مقدس الفاظ (اسمائے حسنٰی) خدائی صفات کا عکس ہمارے دلوں پر ڈالتے ہیں۔ اس طرح ذاکر اور مذکور کے مابین موجود فاصلے سمٹنے لگتے ہیں۔ یہ مقدس الفاظ عموماً عربی میں اسمائے خداوندی یا سنسکرت منتروں سے لئے جاتے ہیں۔ اِن دونوں زبانوں کے الفاظ کے معانی ان کے تلفظ میں پنہاں ہیں اور ہم پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان الفاظ کے تکرار سے جو صوت وارتعاش جنم لیتا ہے وہ ہماری روح کو چھو لیتا ہے۔[5]

صوفیانہ ریاضتوں میں استعمال ہونے والے الفاظ ضمنی طاقتوں کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے صوفیائے کرام نے صدیوں سے انہیں الوہی شعور کے دروازے کھولنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ الفاظ انسان کا تعلق لاشعوری طور پر اُس دنیا سے جوڑتے ہیں جو انسان کے اجتماعی شعور کی دنیا ہے۔

تاہم ان الفاظ کے ذکر اور ورد کا حکم صرف مرشدِ کامل ہی دے سکتا ہے۔ مریدان الفاظ کو مقدس راز کے طور پر امانت سمجھ کر سب سے چھپا کر دہراتا ہے۔ اسی لئے تصوف کے اس اہم ترین پہلو پر ہم اس مقام پر تفصیل میں نہیں جائیں گے۔

روحانی تربیت کے دوران سانس کی مشقیں بھی نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ تمام صوفیائے کرام نے سانس کی ریاضتوں کو خاص اہمیت دی ہے جس میں سانس کا درست ردھم اور سانس پر قابو پانا شامل ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اس ''پراسرار'' موضوع پر نہایت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔

''سانس زندگی کی ڈور ہے۔ یہ وہ شیرازہ ہے جو جسم کے تمام عناصر کو مربوط رکھتا ہے۔ جب یہ طاقت گھٹنے لگتی ہے تو قوتِ ارادی بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ جس طرح سورج کی طاقت تمام سیاروں کو قابو میں رکھتی ہے اسی طرح سانس کی طاقت جسم کے ہر حصے کو قابو میں رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ سانس جسم کو پاک کرتی ہے اور اسے ہر لمحہ نئی توانائی، نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ اُن تمام گیسوں کو جسم سے نکالتی ہے جو جسم کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ اُن تمام مادی اور غیر مادی عناصر کو جسم کا حصہ بناتی ہے جو حیات قائم رکھتے ہیں''۔[6]

اس کے بعد ہم سانس کی روحانی معنویت کی طرف آتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''سانس باطنی زندگی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ سانس انسان کی فانی اور لافانی دنیاؤں کے درمیان رابطہ سازی کا کام کرتی ہے۔ تمام وجدانی اور معجزاتی طاقتیں سانس سے حاصل ہوتی ہیں۔ سانس کو پاک راستہ چاہیے اور یہ پاک راہ انسانی جسم ہے۔ اگر اس کا راستہ رک جائے تو سانس آزادی سے نہیں چل سکتی۔ ہوا زندگی ہے۔ لیکن جب یہ زمین پر پہنچتی ہے؛ زمین کا اثر قبول کر لیتی ہے اور آلودہ ہو جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال سانس کی ہے۔ سانس فی ذاتہ پاک ہے۔ لیکن جب اُس کا گھر یعنی جسم، پاک نہ ہو تو اس کی پاکیزگی زائل ہو جاتی ہے''۔[7]

اس لئے روحانی ارتقاء کے لئے سانس کے ذرائع کی پاکیزگی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے سانس کی مشقیں ضروری ہیں۔ یہ راہِ خداوندی پر ہماری مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

''سانس، ایک صوفی کے نزدیک، خدا اور اُس کے درمیان ایک پُل کا کام دیتی ہے۔ صوفی کے لئے یہ ایک رسی ہے۔ ایک ایسی رسی جو عالمِ بالا سے بندھی ہے اور زمین پر لٹک رہی ہے۔ صوفی اس کی مدد سے اوپر جا سکتا ہے''۔[8]

Marfat.com

سانس کے کنٹرول کے بغیر ارتکاز و استغراق میں کامیابی ممکن نہیں ہے۔

> ''صوفی ایک رسی تلاش کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ اپنے ذہن کو ایک مقام پر باندھ سکیں۔ یہ رسی کیا ہے؟ یہ رسی سانس ہے۔ اسی کی مدد سے وہ ذہن کے اشہب لگام کرتے ہیں اور انہیں ایک مقام پر مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں۔ اسی رسی کی مدد سے وہ ذہن کو اُس مقام پر جما دیتے ہیں جہاں وہ اِسے جمانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو اپنے لعاب سے گھونسلا بناتا ہے۔ اسی طرح صوفی اپنی تازہ سانسوں سے ماحول بناتا ہے اور رہنے کے لئے مقناطیسیت اور نور کو جنم دیتا ہے''۔[9]

یہ ریاضتیں اُس مقصد کے حصول کی تیاری ہیں جو سالک کے لئے اُس کی منزل کا حصول آسان بناتی ہیں۔ ان ریاضتوں سے حاصل کردہ توانائی سے سالک اپنے جسم اور ذہن کی تطہیر کرتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کہتے ہیں:

> ''یہیں سے انسانی ارتقاء کی حدود شروع ہوتی ہیں۔۔ اس سے اگلی منزل الوہی ارتقاء ہے''۔

اس سطح پر پہنچ کر ''کرتا'' کا مان چھوٹ جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو فاعلِ مختار سمجھنا ترک کر دیتا ہے۔ اس مقام پر سالک passive ہو جاتا ہے۔ اور خاموشی میں اپنے آپ کو مشیتِ ایزدی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس مقام کو حضرت عنایت خانؒ ''روحانی استراحت'' کہتے ہیں۔ یہ خود سپردگی کا مقام ہے جہاں قوتِ ارادی اور قوتِ اختیار کو موقوف کرنا پڑتا ہے۔ ارتکاز و استغراق کے بعد، جب ہمارا جسم پرسکون ہو جاتا ہے، ہم قدرتی آرام پاتے ہیں۔ اس خاموشی میں، احساسات اور افکار کو بھلا کر، ہم خالص شعور کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ کریم لمحہ ہے جب روحِ ازلی کا پارس ہمیں چھو سکتا ہے۔

> ''تیسرا مرحلہ مراقبہ ہے۔ اس مرحلے کا ذہن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مرحلۂ شعور ہے۔ مراقبہ باطن میں گہری ڈبکی لگانا ہے۔ اس ڈبکی کے بعد جب ہم ابھرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ہستی کے بلند مقامات پر پاتے ہیں۔ ابھرنے پر ہم اپنے آپ کو اِس قدر کشادہ محسوس کرتے ہیں کہ کائنات بھی اس وسعت اور کشادگی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مراقبے کا کیف و سرور اسی تجربے میں پنہاں ہے''۔[10]

Marfat.com

ان تجربات کے ذریعے سالک عرفانِ ذات کے مرحلہ پر پہنچتا ہے:

''عرفانِ ذات تین درجات کا ثمر ہے۔ تیسرے تجربے کے دوران سالک مراقبے کا پیچھا کرتا ہے لیکن اس درجے پر مراقبہ سالک کا تعاقب کرتا ہے۔ بالفاظِ واضح تر اس مقام پر گائیک گیت نہیں گاتا؛ گیت گائیک کو گانے لگتا ہے۔ اس چوتھی سطح پر شعور الوہی وسعتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر روح پرت در پرت بندِ قبا کھولتی ہے۔ اس مقام پر سالک زندگی کے ہر جوہر سے ہم کلام ہوتا ہے اور حقیقی ''میں'' کا تجربہ کرتا ہے۔ اسی مقام پر زندگی کے جملہ مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے''۔[12]

3۔ ذہنی پاکیزگی:

اس طرح روحانی تربیت دانشِ روحانی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اور سالک اپنے شعور کو زمینی کثافتوں سے بلند کرنے میں کامیاب ہو کر مقصدِ حیات پالیتا ہے۔ یہ روحانی ارتقاء کا عمودی خط ہے۔ ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے باطنی راستوں کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔ مراقبہ ہمیں مادی شعور (ذہن) سے بلند کرتا ہے۔ اور ہم ذہن کو پاک کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب تک ہمارا ذہن غیر لچکدار اور محدود افکار کی دلدل میں پھنسا رہتا ہے اسے منافرت آمیز خیالات زہر آلود کرتے رہتے ہیں۔۔ ہم کچھ وقت کے لئے ان احساسات سے بچنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا کثیف اور غیر خالص ذہن ایک بار پھر روح کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اور روح ایک بار پھر ذہن کے ناخوشگوار قید خانے میں قید ہو کر رہ جاتی ہے۔ خارجی زندگی کے حالات و واقعات بے چینی اور انتشار کا باعث بنتے ہیں اور ہمارے شعور کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اس لئے حقیقی روحانی ارتقاء کے لئے زندگی کے خارجی پہلوؤں کی تطہیر لازم ہے تاکہ ہمارا ذہن پاک ہو سکے۔ اس مقام پر ہم روحانی ارتقاء کے افقی خطوط کی پیروی کرتے ہیں جسے حضرت عنایت خانؒ ''وسعتِ شعور'' کہتے ہیں۔

وسعتِ شعور کے حصول کے لئے پہلی شرط فراموشی یا اَن سیکھنا (unlearning) ہے۔ یہ سماج کے دیے ہوئے علم اور حادثاتی شناختوں کو بھلانے کا عمل ہے۔ ہم اپنی زندگیوں کا آغاز سیکھنے سے کرتے ہیں۔ ہم والدین سے سیکھتے ہیں۔ مدرسوں اور جامعات میں سیکھتے ہیں۔

Marfat.com

معاشرہ اور تعلیمی ادارے ہمیں وہ سب سکھاتے ہیں جو کامیاب زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ہم اپنے تجربات سے سیکھتے ہیں اور اس غیر رسمی تعلیم کی مدد سے ہم اپنے کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔ تاہم سماج کا دیا ہوا علم ہمارے ذہن کو محدود کرتا ہے اور ہمارے اندر غیر لچکدار رویوں کی آبیاری کرتا ہے۔

جب ہم باطنی زندگی پر غور کرنا شروع کرتے ہیں تو سماج کا دیا ہوا علم اور شناختیں ہماری راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ سماج کے دیے ہوئے علم اور فرضی شناختوں کا بوجھ اتارے بغیر ہمارے لئے باطنی دنیا کا سفر مشکل ہو جاتا ہے۔ سماج کا دیا ہوا علم ہمیں اس قدر بھاری کر دیتا ہے کہ ہمارے لئے آکاش میں اڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل فراموشی یا اَن سیکھنے کا تصور ہمیں مذبذب کرنے والی پہیلی معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہ پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ unlearning کیا ہے؟

''روحانی خزانوں کا حصول، ابتدا سے آخر تک، وہ سب بھلانا ہے جسے سکھایا گیا تھا۔ لیکن کوئی شخص وہ سب کیسے بھلا سکتا ہے جو کچھ اُس نے آج تک سیکھا ہے۔ جو کچھ انسان نے سیکھا ہے وہ اُس کے اندر ہے۔ جب انسان کو دانش حاصل ہوتی ہے وہ کچھ بھولنے سے حاصل ہوتی ہے جو کچھ اُس نے سیکھا ہوتا ہے۔ جونہی انسان کی دانش میں اضافہ ہوتا ہے وہ سماج کے دیے ہوئے علم سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ دانش جتنی کم ہو۔۔ انسان اپنے تصورات پر اتنی ہی مضبوطی سے قائم ہو جاتا ہے۔ دانش مند آدمی وہ ہے جو ایک بچے سے بھی سیکھنے کے لئے تیار ہے۔ جو دوسروں کی بات سننے کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک بے وقوف آدمی ہمیشہ اپنے خیالات اور واہمات پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دانش مند آدمی اپنے خیالات اور تصورات پر نظر ثانی کر سکتا ہے جبکہ ایک بے وقوف آدمی اُن پر ٹھہر جاتا ہے۔ اسی لئے اُس کے آگے بڑھنے کا عمل رُک جاتا ہے''۔ [13]

اس لئے سب سے پہلے انسان کو اپنے خیالات، عقائد اور تصورات کی اضافی نوعیت کو سمجھنا چاہیے۔ انسان کو نئے تصورات اور خیالات کے لئے ہمیشہ اپنے دل میں جگہ رکھنی چاہیے۔

Marfat.com

اس طرح وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''صوفی ہر چیز کو نہ صرف اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے بلکہ دوسروں کے زاویۂ نظر سے بھی دیکھتا ہے''۔

اس طرح ایک صوفی کا چلن عام لوگوں سے اس لئے بھی جدا نظر آتا ہے کیونکہ لوگ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں اور صوفی دونوں آنکھوں سے۔ عام لوگ نہ صرف اپنے نقطۂ نظر پر استوار رہتے ہیں بلکہ ساری زندگی اپنی غلطیوں سے نظریں چراتے اور اُن کو منطقی ثابت کرنے کے لئے دلائل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ہی تصورات کی محدود دنیا میں اپنے آپ کو دفن کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت ڈالنے سے ہم اپنے زاویۂ نظر کو وسعت عطا کر کے بصیرت پیدا کرتے ہیں۔ اور انسان اپنے ذہن پر لگی ہوئی گرہیں آسانی سے کھول پاتا ہے۔

ابتداء میں اِن ہدایات پر عمل کرنا مشکل لگتا ہے۔ تاہم اکثر صورتوں میں یہ سب حیران کن حد تک قابلِ عمل محسوس ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہمیں دوسروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ اور اس میں کامیاب ہونے کے لئے لازم ہے کہ ہم دوسروں کو سمجھ سکیں۔۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھنا۔۔ مختلف آراء کو یکجا کرنا اور اتفاقِ رائے تک پہنچنا ہماری روزمرہ کی سماجی و سیاسی ضروریات ہیں۔ لہٰذا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کا اندازِ فکر (approach) ہمارے لئے معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو ہماری مخالفت کر رہے ہوں اُن کا نقطۂ نظر سمجھنا ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ صوفیانہ ادائے فکر ہماری دنیوی زندگیوں میں بھی مفید ہے۔ اس سے ہمارے لئے تعاون کے دروازے کھلتے ہیں اور اکثر صورتوں میں معقول سمجھوتوں کی راہ اختیار کر کے الجھاؤ اور فساد سے بچا جا سکتا ہے۔

اگر ہم مغرب میں سائنسی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نت نئی سائنسی ایجادات اور دریافتوں نے لوگوں کو ہر نئے تصور، فکر اور نظریے کو سمجھنے کے لئے تیار کر دیا تھا۔

ذہنی تطہیر کا سب سے اہم پہلو ''دُرست میں غلط اور غلط میں دُرست'' دیکھنے کا فن سیکھنا ہے۔ اگر ہم یہ فن سیکھ لیں تو غلط اور دُرست کے محدود پیمانوں سے بلند ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ جان لیتے ہیں کہ یہ محدود پیمانے صرف عام ''استعمال'' کے لئے ہیں۔ کائنات کے بلندترین مراتب میں

Marfat.com

اِن کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ فن ہمارے فکری افق میں بحرِ آسا وسعت لاتا ہے اور ہمیں گہری تفہیم کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

''ذہنی تطہیر کی منزل اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان بھید واسرار کی دنیا سے دُور نکل آتا ہے۔ اچھا اور بُرا، دُرست اور غلط، نفع اور نقصان، دُکھ اور سکھ۔ یہ تضاد۔ یہ بھید انسانی ذہن اور تصورات کو دوئی کے زہر سے بھر دیتے ہیں۔ اگر ہم اضداد سے ماورا ہو جائیں تو دشمن دوست کا درشن بن سکتا ہے۔ ہمیں زہر میں امرت دکھائی دے سکتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک زندگی اور موت کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں اضداد کی موت واقع ہو جاتی ہے اور ہم کثرت کے پردے میں مستور وحدت کے دیدار کے قابل ہو جاتے ہیں''۔[14]

اس طرح اضداد سے ماورا ہونے کا ہنر سیکھتے ہیں۔ اور یہ اضداد ہی ہیں جنہوں نے ہمارے تصورات کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ وحدت اور توحید اضداد سے پاک ہونا ہے کیونکہ خدا اضداد سے منزہ ہستی کا نام ہے۔ صوفی کا مقصود اسی وحدت کا حصول ہے جس کی راہ میں اضداد کا پردہ حائل ہے۔ ذہنی تطہیر اضداد کے اس پردے کو جلا کر بھسم کرنے کا نام ہے۔

ذہنی تطہیر کے بغیر تزکیۂ قلب ممکن نہیں۔ کیونکہ دل ذہن کی گہرائی کا نام ہے۔ ہمارے احساسات اسی گہرائی میں قیام پذیر ہیں۔ جب ہم اپنے ساتھی انسانوں کا نقطۂ نظر سمجھنے لگتے ہیں تو ہماری غیر لچکدار انا کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں من و تو کی دیوار گر جاتی ہے اور ہمیں ہر سُو وحدت جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ یہیں سے محبت، عالمگیر یگانگت، عفو و درگزر اور رحم دلی کے الوہی جذبات کا جنم ہوتا ہے۔ وحدت ایک حیران کن اور کامل آزادی سے ہم کنار کرنے والا تجربہ ہے۔

وحدت کا تجربہ ہمارے انفرادی شعور، مختلف شخصیات اور مخلوق کے درمیان بھید گرا دیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ جانے والوں کے نزدیک ''دوسراہٹ'' ہی سب سے بڑا فریب بن جاتی ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔۔ ''یہاں کوئی دوسرا نہیں۔۔ ہر طرف اُس ایک کا جلوہ ہے''۔

حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''پاک ہونا بلند ہونا ہے۔ ایک لمحے کی بلند نظری سے کئی برسوں کی بداعمالیوں کا کفارہ ممکن ہے''۔[15]

ہمیں اپنے ذہنوں کے آئینوں کو دھول، زنگ اور مٹی سے پاک کرنا ہے۔ دوسراہٹ، منافرت اور من وتو کی جنگ نے ہمارے ذہن کے آئینوں کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔ اگر ہم اپنے ذہن کو ذات حقیقی پر مرکوز رکھیں۔۔ یہ آئینہ اُس کی تجلی سے چمک دمک اٹھے گا۔ خدا ہمارے ذہن کے آئینے میں اپنا درشن دیکھ کر خود آگہی کا مقصد پورا کرے گا جو اُس کے نزدیک کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تک ہمیں روحانی تربیت کا عمودی خط اور وسعتِ شعور کا افقی خط لے کر جاتا ہے۔

4۔ انتقالِ دانش:

بلاشبہ یہ راستہ اتنا آسان نہیں ہے۔ روحانیت پورا آدمی مانگتی ہے۔ بالفاظِ دیگر روحانی راستوں پر کامیابی سے چلنے کے لئے پوری زندگی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس راستے پہ چلنے والوں کو قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس راستے پر قدم رکھتے ہی ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی انجان علاقے میں سفر کر رہے ہیں اور انجان سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ اس دنیا میں ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اُس سے مختلف ہوتا ہے جو کچھ ہم خارجی دنیا میں سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ کوئی پیرِ کامل آپ کے لئے روحانی راہوں کو روشن کرنے کے لئے تیار ہو۔ کوئی ایسا صاحبِ دل جو خود روحانی ارتقاء کی منازل تک رسائی پا چکا ہو۔ اُس کی ہدایات سے فیض یاب ہونے کے لئے اتباعِ روحانی کی ضرورت ہے۔ روحانی شاگردی کے اس طریقۂ کار نے مذہبی روایات میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک روحانی معلم، مرشد یا گرو، کی تقلید اعتماد، محبت اور روحانی بھروسے کی فضا کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کا آغاز بیعت سے ہوتا ہے اور پیر و مرید کے درمیان روحانی رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر مرید اپنے روحانی رہنما سے ہدایات وصول کرتا ہے اور اُس کی رہنمائی میں آگے بڑھنے کا حلف اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد مرشد اپنے مرید کے رجحانات اور شخصیت کے مطابق اُسے روحانی ریاضتیں تجویز کرتا ہے۔ پیرِ کامل اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر مرید کے لئے روحانی مجاہدات تجویز کرتا ہے۔ تاہم اِن ریاضتوں اور مجاہدات میں گہری معنویت کا رس اُس وقت گھلتا ہے جب پیر اور مرید کے درمیان عقیدت، بھروسے اور عشق کا جنم ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس کے ساتھ ساتھ روحانی معلم مرید کی ذہنی تطہیر میں بھی تعاون کرتا ہے۔ وہ مرید کو متبادل نظریات اور پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے تاکہ مرید کے لئے unlearning کا مرحلہ آسان ہو سکے۔ اس مقام پر مرشد پر گہرا اعتماد شرط ہے۔ ورنہ بہت سے لوگ، جو جرأتِ انکار کا حوصلہ نہیں رکھتے، کانپ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بعض یہ سوچ کر کانپ جاتے ہیں کہ مرشد انہیں کفر کے راستے پر لگا رہا ہے۔ اور بعض دُرست اور غلط کی روایتی تقسیم کی زد میں آ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور ایک بار پھر جہالت کے پُرفریب ''اجالوں'' میں دبک جاتے ہیں۔

پیر اور مرید کے مابین گہرے اعتماد کا رشتہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مرید اکثر علمائے کرام کے مذہب پر یقین رکھتے ہیں جو ''رنگ دے سکتے ہیں لیکن رنگ چڑھا نہیں سکتے''۔ اس کے لئے علاوہ بعض مرید منطق گزیدہ ہونے کی وجہ سے ہر بات کی وضاحت طلب کرنے لگتے ہیں اور جواب نہ ملنے پر تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ روحانی تعلیمات الفاظ سے شروع تو ہو سکتی ہیں لیکن ان کا منتہیٰ الفاظ نہیں ہیں۔ یہاں تو مرشد نے اپنا شعور مرید کے حوالے کرنا ہے۔ مرید کے شعور پر اپنے شعور کا عکس ثبت کرنا ہے۔ مرشدِ کامل مرید کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو جان کر حقیقۃ الحقائق کو جان لے۔ حقیقی روحانی معلم مرید کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اُس کی رہنمائی سے بھی آزاد ہو جائے۔

صوفی تحریک میں حضرت عنایت خانؒ نے مغرب میں صوفی مدرسے کی بنیاد رکھی تھی۔ جس میں باطنی تہذیب اہم ترین سرگرمیوں میں سے ایک تھی۔ وہ لوگ جو باطنی راستوں پر چلنا چاہتے ہیں بیعت کے بعد صوفی مدرسے سے آج بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مغرب میں یہ مدرسہ حقیقت کی تلاش میں نکلے ہوئے اُن لوگوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں جنہوں نے سائنس اور فلسفے کے میدانوں کی خاک چھانی ہے لیکن اُن کا دامن ہنوز خالی ہے۔ یہ لوگ جب متلاشیانِ حقیقت کے قدیم ترین کاروان میں شامل ہوتے ہیں تو اِن کی پیاس ہمیشہ کے لئے بجھ جاتی ہے۔

Marfat.com

باب 9

تہذیبِ اخلاق

1۔ اچھے اور بُرے کا مطلب:

جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ راہِ تصوف پر چلنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ''درست میں غلط اور غلط میں درست دیکھنا'' سیکھ لیں۔ کیونکہ صوفی کا مقصد اضداد سے ماورا ہونا ہے۔ اضداد سے ماورا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ کثرت کا سراب انسان کے ذوفرعی حواس پیدا کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہر چیز دو متصادم ٹکڑوں میں بٹی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ اچھے اور بُرے کی تمیز ہماری خارجی زندگی میں ضروری ہے۔ جہاں، ایک ذمہ دار انسان کے طور پر ہمیں درست اور غلط میں تمیز کرنا ہوتی ہے۔ لیکن صوفی کا مقصود حقیقت مطلقہ یعنی ذات خداوندی ہے۔ اور خدا کی کوئی ضد نہیں ہے۔ حضرت عنایت خانؒ نے *Vadan* میں لکھا ہے:

> ''کوئی چیز اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک دو اضداد اس میں تحلیل ہوکر وحدت کا روپ نہ دھارلیں''۔

اس حکمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم جان سکتے ہیں کہ خداوندِ کریم، جو قادرِ مطلق ہے، اپنی مخلوق کی رہنمائی کے لئے ظاہری طور پر متحارب قوتوں کو استعمال میں لاتا ہے۔ وہ ایک ہے۔ لیکن اُس نے ہر چیز کے جوڑے بنادیے ہیں۔

> ''ہم نظامِ فطرت میں ایک قانون کا راج دیکھ سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ کائنات رفتہ رفتہ اُس مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اسے بنایا گیا تھا۔ اس لئے اچھا اور بُرا، درست اور غلط سب مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں''۔[1]

Marfat.com

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خیر اور شر مطلق تصورات کی بجائے اضافی تصورات ہیں۔ جو کچھ اچھا ہے معروضی طور پر سب کے لئے اچھا نہیں ہو سکتا۔ کسی کا زہر دوسرے کے لئے امرت ہے۔ جو خیر ہے ہر حال میں خیر نہیں ہو سکتا۔ ہر نسل، ہر قوم، ہر مذہب کے اپنے معیارات ہیں۔ ہر ایک کے نزدیک خیر اور شر کا پیمانہ مختلف ہے۔ ہر کوئی اچھائی اور بُرائی کو اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اُس قانون کا سمجھنا مشکل ہے جس کے دم سے اضداد کائنات کا نظامِ کار چلا رہی ہیں۔[2]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون کیا ہے؟ عملی زندگی میں اُس وقت تک ہم اچھے اور بُرے میں تمیز کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ہم ابھی تک زمینی معیارات سے ماورا ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے؟ حضرت عنایت خانؒ اس سوال کا نہایت خوبصورت جواب پیش کرتے ہیں۔ اور اُن کا جواب شعور کی توسیع سے متعلق ہے۔

> ''جب ایک انسان قانونِ ارتعاش کو سمجھ لیتا ہے۔۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ ظاہری سطح پر ہر ہستی۔۔ ہر چیز ایک دوسرے سے جدا ہے۔ لیکن داخلی سطح پر سب ایک ہے۔ سب ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ سب ایک ہے۔ اس لئے جب ہستی کے ستار کا کوئی تار بھی پریشان ہوتا ہے۔۔ اس کا اثر ہستی پر ضرور پڑتا ہے۔ اس لئے کسی بھی قسم کا خیال، کوئی بھی بات۔۔ اور کوئی بھی عمل جو امن میں۔۔ ترنم میں خلل ڈالے غلط ہے۔۔ شر ہے اور گناہ ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ امن کا۔۔ ترنم کا باعث بنے۔۔ خیر ہے اور نیکی ہے۔
>
> زندگی ایک گنبد کی مانند ہے۔ اس کی فطرت بھی گنبد کی طرح ہے۔ جس میں کوئی ایک حصہ بھی بے ہنگم اور پریشان ہو تو کُل کے لئے پریشانی کا باعث بنتا ہے۔۔ اور یہ پریشانی اور بے ترتیبی اُسی کی طرف لوٹتی ہے جس نے اِسے پیدا کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ ہستی کی سطح پر امن اور خوش آہنگی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔۔ تو یہ خوش آہنگی اور امن ہستی کے رگ و ریشہ کو خوشی دیتا ہے اور یہ خوشی آپ کی طرف لوٹتی ہے۔ اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا کا یہی راز ہے''۔[3]

Marfat.com

قانونِ ارتعاش اس اقتباس کا پہلا اہم عنصر ہے۔ اس کا اشارہ ہمارے احساسات اور ہمارے ردھم کی طرف ہے۔ ہمارے اعمال کے پیچھے کون سے احساسات کارفرما ہیں۔۔ اور جب ہم عمل کرتے ہیں تو ہم کس ردھم کے زیرِ اثر ہوتے ہیں؟ اِن سوالات سے ہی اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ ہم اپنے اعمال کے ذریعے کس حد تک اور کس طرح دوسروں کو اور اپنے آپ کو خوشی دے رہے ہیں۔ اسی لئے حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''وہ سب خیر ہے جو آپ کی اور دوسروں کی خوشی کا باعث بنے''۔[4]

اس خوشی۔۔ اس گہری باطنی خوشی کا راز کیا ہے؟ اس کا راز باطنی سطح پر تمام تخلیق کی وحدت کا شعور ہے۔ امن وسکون ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ باطنی سطح پر ہر چیز ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اس لئے کوئی ایسا خیال، گفتگو اور عمل جو انتشار پیدا کرے بُرا عمل ہے۔ شر ہے۔۔ گناہ ہے۔ اور جو کچھ امن لائے، سکون اور طمانیت کا باعث بنے دُرست عمل ہے۔ نیکی ہے۔۔ خیر ہے۔

ہم اپنے دل میں سکون کا تجربہ اُس وقت کرتے ہیں جب ہمارا دھیان خدا کی طرف ہوتا ہے۔ اور ہم خارجی زندگی میں ہم آہنگی کو برقرار رکھ کر اس سکون اور طمانیت کے باطنی خزانوں کو باہر کی دنیا میں بانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم آہنگی بظاہر مختلف نظر آنے والی اشیا، کیفیات اور احساسات کے مترنم رشتے کا نام ہے۔ ہم آہنگی سے حُسن اور محبت جنم لیتی ہے۔ حسن اور محبت اختلاف کا توڑ ہے اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ہم آہنگی ایک اہم ترین روحانی اور اخلاقی نصب العین ہے۔ اس کا مطلب ہے شر ہم آہنگی کی عدم موجودگی کا نام ہے۔ شر کا دامن حُسن اور محبت سے خالی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔

2۔ ارتقائے خُلق:

لیکن ہم ان معیارات پر روزمرہ زندگی میں کس طرح پورے اتر سکتے ہیں؟ ہم روزمرہ کشمکش اور تفاوت پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں؟ حضرت عنایت خانؒ اپنی کتاب Moral Culture میں ہمارے روزمرہ کے رویوں کی اصلاح کے لئے بہت سے قابلِ عمل مشورے دیتے ہیں۔ حضرت اس میدان میں کوئی غیر لچکدار اخلاقی ضابطہ پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ہمیں وہ راستہ بتاتے ہیں جس پر چل کر ہم اخلاقی طور پر رفتہ رفتہ بلند ہو سکتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ

ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح ہم اپنا نقطۂ نظر وسیع کر کے اپنی اخلاقی حالت بدل سکتے ہیں۔اس کی بجائے کہ ہم کسی بلند اخلاقی ضابطے پر اچانک چھلانگ لگا دیں۔ہمیں اُس مقام سے آغاز کرنا چاہیے جہاں پر ہم موجود ہیں۔

مختلف لوگوں کے ساتھ ہمارے مختلف رشتے ہیں۔کوئی ہمارا دوست ہے تو کسی کو ہم دشمن سمجھتے ہیں۔کوئی ہمارا عزیز ہے تو دوسرا ہمارا رشتہ دار ہے۔ایک ہمارا نوکر ہے تو دوسرا ہمارا مالک ہے۔ان رشتوں کے علاوہ ہمارا خدا سے بھی ایک رشتہ ہے۔ہم اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ سمجھتے ہیں۔حتیٰ کہ علمائے کرام ہمیں یہ بھی باور کراتے ہیں کہ خدا کا انسان سے کوئی رشتہ نہیں۔کیونکہ خدا ایک اعلیٰ ترین ہستی ہے تو انسان نجس اور گناہگار۔جن لوگوں سے ہم اپنا تعلق تسلیم کرتے ہیں اُن کے حوالے سے ہم بہت حساس ہو جاتے ہیں۔اور اکثر اوقات ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ہم اُن سے محبت کرتے ہیں یا نفرت۔اس موقع پر ہمیں اُس قانون پر عمل کرنا چاہیے جسے حضرت عنایت خانؒ قانونِ تبادل (law of reciprocity) کہتے ہیں۔یہ قانون اُن کے لئے ہے جو اپنے اور دوسروں کے درمیان فرق محسوس کرتے ہیں۔جو یہ سوچتے ہیں کہ ہم فلاں ہیں اور فلاں آدمی فلاں ہے۔[6]

یہ قانون ہم آہنگی لاتا ہے۔اور ہمارے رویوں میں انصاف، محبت کا انقلاب برپا کرتا ہے۔قانونِ تبادل کی پیروی آسان ہے۔لیکن انسان کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے انا پرستانہ رجحانات اُس کی بصارت کو دھندلا دیتے ہیں اور وہ نہ جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اپنے اردگرد تمام لوگوں سے زیادہ اہم سمجھتا رہتا ہے۔انسان کی انا اکثر اُسے اندھا کئے رکھتی ہے۔حضرت عنایت خانؒ اپنی گہری نفسیاتی بصیرت کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

> ''ہر انسان کے نزدیک اُس کی ذات ہی سب سے اہم ہے۔جب ہم دوسروں سے اپنے تعلقات کا میزان کرتے ہیں تو اپنا پلڑا ہمیشہ بھاری رکھتے ہیں''۔[7]

قانونِ تبادل پلڑے برابر رکھنے کا قانون ہے۔اس قانون پر عمل کر کے ہم توازن برقرار رکھ سکتے ہیں۔

> ''اس لئے توازن برقرار رکھنے کی خاطر ہمیں رحم دلانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔نیک افکار، مدد، احترام ساتھی انسانوں کے لئے بہترین

Marfat.com

تحائف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم خود کسی کا دل دکھا رہے ہیں۔۔ کسی کو دھوکہ دے رہے ہیں تو دوسروں کے اس رویے پر ہمیں زیادہ دکھی نہیں ہونا چاہیے''۔[8]

اس طرح یہ قانون ہماری اخلاقی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس قانون کی وضاحت میں حضرت عنایت خانؒ کی نظر انا کے محدود تصور سے بہت دور جاتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ زور دیتے ہیں کہ:

''دوسرے سے مخصوص برتاؤ کرتے وقت ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ ہمارا یہ برتاؤ اُس پر خوشگوار اثرات مرتب کرے گا یا ناخوشگوار صورتِ حال کو جنم دے گا۔ اچھے برتاؤ کی صورت میں اُس سے بھی بہتر برتاؤ کریں جس کی آپ دوسرے سے توقع کر رہے ہیں۔ اور ناخوشگوار برتاؤ کی صورت میں آپ کا عمل دوسرے کے متوقع ناخوشگوار عمل سے کم ہونا چاہیے۔ بالفاظِ واضح تر اگر کوئی آپ سے خوشگوار عمل کی توقع کر رہا ہو تو آپ کا عمل اُس کی توقع سے زیادہ خوشگوار ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی آپ سے ناخوشگوار عمل کی توقع کر رہا ہو تو آپ کا عمل اُس کی توقع سے کم ناخوشگوار ہونا چاہیے''۔[9]

اس طرح ہم اپنی ہمدردی اور محبت کا دائرۂ کار وسیع کر سکتے ہیں اور اپنے اخلاقی فرائض بطریقِ احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔ تاہم حضرت عنایت خانؒ ہمیں خبردار کرتے ہیں:

''اخلاقی فرائض کی بجا آوری میں فیاضی اور رضامندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر پائے تو ہم اخلاقی فرائض کی بجا آوری میں ناکام رہیں گے اور ہماری خوش اخلاقی منافقت بن جائے گی''۔[10]

اس سے ظاہر ہے کہ ہماری نیت کا دارومدار عمل پر نہیں بلکہ عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ خلوص اور ہمدردی ہمارے اعمال کی قدر بڑھاتی ہے۔ یہ سب کچھ اُس فلسفے کا عملی اطلاق ہے جس کا مطالعہ ہم نے گذشتہ باب میں کیا ہے۔ گذشتہ باب میں ہم نے شعور کی وسعت پر بات کی تھی۔ تاہم قانونِ تبادل کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہم نے اس کا اطلاق اُن لوگوں پر بھی کرنا ہے

Marfat.com

جنہیں ہم اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔اس موضوع پر حضرت عنایت خانؒ حقیقت پسندانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں:

''بے عزتی کا بدلہ بے عزتی اور تکلیف کا بدلہ تکلیف ہی نظر آتا ہے[11]۔ لیکن ہمیں دوستوں کی نسبت دشمن سے برتاؤ کے وقت زیادہ تحمل اور شائستگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے''۔[12]

آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون کا اطلاق اُس وقت تک نہیں کرنا چاہیے جب تک دشمن کے انتقام کا بدلہ رحم دلی سے دیا جا سکتا ہے۔حضرت عنایت خانؒ ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ:

''ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی ہمارا دشمن نہ بن جائے۔خاص طور پر ہمیں خبردار رہنا ہے کہ ہم کسی دوست کو اپنا دشمن نہ بنالیں۔دشمن کو معاف کر دینا اور دشمنی بھلا دینا ہر لحاظ سے درست ہے۔انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں پہل کرے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دشمنیاں بھلا کر ماضی کے مسموم واقعات بھول جائیں''۔

دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کے زاویۂ نظر سے دیکھنے کے قابل بنائیں۔اس طرح ہم بہت سی تصوراتی دشمنیوں اور تخیلاتی منافرتوں سے بچ سکتے ہیں۔دراصل ہم کسی کو معاف کرنے کے قابل اُسی وقت ہوتے ہیں جب ہم اپنے آپ کو اُس کی جگہ رکھ کر دیکھتے ہیں۔یہاں سے ہم اخلاقی ارتقاء کی دوسری منزل تک پہنچتے ہیں جسے قانونِ احسان (law of beneficence) کہتے ہیں۔

''جب ایک انسان یہ دیکھ لیتا ہے کہ وہ ساتھی انسانوں اور حیات سے مختلف اور جدا ہونے کے باوجود ہستی کی اُسی ڈور سے بندھا ہے جس سے سب بندھے ہیں۔جب وہ جان لیتا ہے کہ کارخانۂ قدرت میں سب ایک ہیں۔جب اُس پر یہ راز آشکار ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے گنبد میں رہ رہا ہے جہاں خیر اور شر اپنے ماخذ کی طرف لوٹتے ہیں۔تو اُسے قانونِ احسان کا فہم و ادراک نصیب ہوتا ہے''۔[14]

جب ہم دوسروں کو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہم کس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے افکار اور

Marfat.com

احساسات دوسرے انسانوں کے ذہنوں میں کس طرح منعکس ہوتے ہیں۔اذہان کی دنیا ایک کانچ گھر ہے۔دوسروں کے ذہنوں پر ہم جو بھی عکس ڈالتے ہیں وہ ہماری جانب لوٹتا ہے۔جس طرح ہماری آواز کی گونج ہماری طرف پلٹی ہے ہماری پیدا کردہ کیفیات بھی ہماری طرف پلٹی ہیں۔

اگر ہم یہ جان لیں تو ہمارے اندر محبت اور احساس کی شمع روشن ہوجاتی ہے۔ہم کوئی ناخوشگوار احساس اس لئے بھی پیدا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اُس نے پلٹ کر ہمارا رُخ کرنا ہے۔اس وقت ہم جان چکے ہوتے ہیں کہ ہم سب ہستی کی رسی سے بندھے ہیں۔ہم دیکھنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن کارگاہِ ہستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔سب ایک ہی ذات کا پھیلاؤ ہے۔ اس مقام پر حضرت عنایت خانؒ ہمیں ایک نفسیاتی مشورہ دیتے ہیں جواُن کے صوفیانہ پیغام میں جاری وساری نظر آتا ہے۔

''اپنے اذہان وافکار کو اچھے لوگوں، عظیم خیالات اور مثبت پہلوؤں پر مرکوز رکھیں!''

یہ کوئی اندھاپن یا بصیرت کا فقدان نہیں بلکہ تاثرات کا انتخاب ہے۔ہم جان بوجھ کر اچھے خیالات اور شخصیات پر توجہ اس لئے مرکوز رکھتے ہیں تاکہ ہمارے ذہن کے آئینے میں اُن کا عکس پڑنے لگے۔صوفیانہ اصطلاح میں یہ ''دیکھنا اور نظر انداز کرنا'' ہے۔یہ اصول ہمیں ''باعلم معصومیت'' (knowing innocence) کی منزل پر لے جاتا ہے۔[15]

باعلم معصومیت کا حصول اپنے افکار واحساسات کا خود مالک بننا ہے۔اپنے خیالات و احساسات اور افکار کو لگام کئے بغیر ہم اپنی زندگیوں کے خود مالک نہیں بن سکتے۔کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں زندگی ہمیں وہی کچھ لوٹاتی ہے جو کچھ ہمارا ذہن پیدا اور منعکس کرتا ہے۔

یہ معصومیت ایک عملی اصول ہے جو ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم دوسروں کے اعمال کی قدر پیمائی اور جانچ پڑتال کے ذاتی پیمانوں کا استعمال ترک کردیں۔یہ نسلِ انسانی کی مشترکہ بیماری ہے کہ ہم ہر وقت دوسروں کو اپنے بنائے ہوئے معیارات پر پرکھتے رہتے ہیں۔ہمارے نزدیک اچھائی اور بُرائی کا معیار یہ ہوتا ہے کہ جو ہم جیسا ہے وہ اچھا ہے اور جو ہم جیسا نہیں ہے وہ بُرا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ہم دوسروں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر ہی نظریں جمالیتے ہیں ہمارے اندر بھی وہی کوتاہیاں اور کمزوریاں جنم لینے لگتی ہیں۔اور وہ جو ہمارے الزامات اور تنقید کے پتھروں کا نشانہ بنا ہوا ہے ہمارا دشمن بن جاتا ہے۔غیر ہنرمندانہ تنقید دوسروں کو دفاع پر اکساتی ہے اور کوئی ان خامیوں کو دور نہیں کرسکتا جن کا وہ دفاع کررہا ہو۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا

Marfat.com

''شر کی مزاحمت نہ کریں''۔ حضرت عنایت خانؒ اس کی تشریح کچھ یوں فرماتے ہیں:

''شر آگ کی مانند ہے۔ آگ نہ صرف ہر چیز کو جلاتی ہے بلکہ خود کو بھی بھسم کر دیتی ہے۔ اس لئے آگ طاقتور بھی ہے اور کمزور بھی۔ آگ کے نصیب میں بقا نہیں فنا ہے۔ اسی طرح شر بھی اپنی موت آپ ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ شر کی مزاحمت نہ کریں! کیونکہ شر کی مزاحمت کرنا اُسے زندہ رکھنا ہے۔ جبکہ عدم مزاحمت شر کو اپنی موت آپ مرنے دینے کا نام ہے''۔[16]

اس کا مطلب ہے کہ ہمیں غصے کا جواب غصے سے نہیں دینا چاہیے۔ اگرچہ ایسا کرنا فطری معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ہم شر کو تقویت دے رہے ہوتے ہیں بلکہ اُس کے ردِ عمل میں خود بھی شر کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک بھی ایسا عمل، جس کا محرک شر ہو، ایسے اعمال کے نا ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دے سکتا ہے۔ اپنے ردِ عمل کو قابو میں رکھ کر انسان سمندر میں چٹان کی طرح کھڑا ہو سکتا ہے۔ یہ بات ضروری ہے کہ دوسروں کے خیالات وافکار سے متاثر ہوں لیکن اپنے دل میں کسی کے منفی جذبات کو گھر نہ کرنے دیں۔

ہمیں ہم آہنگی کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ہمیں صرف اُن لوگوں سے ہم آہنگ نہیں رہنا جن سے ہمارا رابطہ یا واسطہ ہے بلکہ اسے معاشرتی اور نظریاتی سطح پر بھی اجاگر کرنا ہے۔

3۔ نفسِ اَمّارہ پر قابو پانا:

خیر کے راستے پر مستحکم اور استوار رہنے کے لئے ہمیں انا سے جنگ لڑنا پڑتی ہے اور اگر ہم ایسا نہ کر پائیں تو اخلاقی و روحانی ارتقاء ناممکن ہے۔ صوفیائے کرام نے واضح طور پر کہا ہے:

''راستہ ایک ہے۔ غیر حقیقی انا کو حقیقی انا میں بدلنا۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر فانی لافانی ہو کر تکمیل پا سکتا ہے''۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے حقیقی اور غیر حقیقی انا میں کیا فرق ہے؟ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''انا ہمارے ذہن کا اہم حصہ ہے۔ اس سے ہمارے افکار، قوتِ استدلال، حافظہ اور قوتِ ارادی تشکیل پاتی ہے۔ یہ اُس وقت پیدا ہوتی

Marfat.com

ہے جب (بوقت صُدور) روح کو جسم اور ذہن عطا ہوتا ہے۔ ذہن، جو دراصل روحِ کل کا حصہ ہے، جسم میں مقید ہونے کے بعد انفرادیت کے فریب کا شکار ہو جاتا ہے''۔[17]

ہم دراصل الوہی شعور کے سہارے زندہ ہیں۔ ہم جسم اور ذہن کے توسط سے جو کچھ بھی کرتے ہیں ہمارے شعور پر منعکس ہوتا ہے۔ ہماری روح پر ہمارے اعمال کا عکس پڑتا ہے اور یہ عکس محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہمارے شعور اور روح پر پڑنے والے تاثرات رفتہ رفتہ گہرے ہوتے رہتے ہیں اور، زمینی حیات کے دوران، ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمارے شعور پر مادی افکار کا مکمل قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنے آپ کو جسم اور ذہن ہی سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ زندگی کا بنیادی واہمہ اور انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ غیر حقیقی انا اُس وقت جنم لیتی ہے جب انسان اپنے آپ کو جسم اور ذہن سمجھنے لگتا ہے۔ غیر حقیقی شعور یا نفسِ کثیف پر قابو پانے کے لئے اس بات کا گہرا احساس لازم ہے کہ ہم جسم اور ذہن نہیں ہیں۔ تاکہ ہم اپنے شعور کی نوعیت کو جان لیں۔۔ اس کے ماخذ کو سمجھ لیں۔ حقیقی ''میں'' سے آشنا ہو جائیں۔ ہماری حقیقی انا آفاقی شعور ہے، روحِ کُل ہے۔ اگر ہماری روح، باعتبارِ حقیقت، روحِ حقیقی سے الگ ہوتی تو خدا ہمیں اپنی ذات سے محبت کا درس نہ دیتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفسِ حقیقی کا ماخذ ذاتِ خداوندی ہے۔ دنیا میں اور روحانی راستوں پر چلتے ہوئے نفسِ محدود قدم قدم پر ہمارا راستہ روکتا ہے۔ یہ ہمارے شعور کی وسعتوں میں حائل ہے۔ اس کے دم سے ہم جزئیات کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ اور ہم یہ نہیں جان پاتے کہ ہمارے اندر بھی ایک کائنات ہے۔

نفسِ کثیف نے دنیا کو اناؤں کا اکھاڑا بنا ڈالا ہے۔ ہر طرف خونخوار انائیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ہر طرف مفادات، خواہشات، افکار اور احساسات کی جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ، یہ جدال و قتال ہم آہنگی اور امن کا دشمن ہے۔ زندگی کا دشمن ہے۔ جتنا ہم اپنے مفادات اور خواہشات کے لئے لڑتے ہیں۔۔ امن اور ہم آہنگی کا قیام اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے غیر حقیقی نفس، جسے صوفیائے کرام نے نفسِ امارہ کہا ہے، کو لگام دے کر اور اس کی تربیت کر کے ہم آہنگی اور امن کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں۔

اس مقام پر حضرت عنایت خانؒ نفسِ امارہ کے تین پہلو سامنے لاتے ہیں:

- جسمانی
- ذہنی اور
- روحانی

جسمانی انا اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم اپنی جسمانی ضروریات اور خواہشات کے غلام بن جاتے ہیں۔ ہم جسمانی انا سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں جسمانی ضروریات اور خواہشات سے پیچھا چھڑا کر دنیا سے کنارہ کر لینا چاہیے؟

دنیا سے منہ موڑ لینا صوفیانہ چلن نہیں ہے۔ تصوف رہبانیت اور ترکِ دنیا کا درس نہیں دیتا۔ کیونکہ تصوف کا مقصود توازن ہے۔ تصوف دنیا سے بھاگنے کا نہیں جاگنے کا درس دیتا ہے۔ ہمیں اس مقام پر صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے جسم کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں ہے۔

ہم اپنی ذہنی ضروریات کی تسکین کا سامان کر سکتے ہیں۔ ہم زندگی کے رنگا رنگ تجربات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں کسی ایک تجربے کا غلام نہیں ہو جانا۔ حضرت عنایت خانؒ اس نقطۂ خیال کو یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''صوفیانہ ریاضتیں ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہم نے اپنی زندگیوں کو روحانی دانش سے منور کرنا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ ہم کس چیز کی خواہش کر رہے ہیں اور اِس خواہش کے کیا اثرات مرتب ہونگے۔ ہمیں خواہش کا محاسبہ انصاف کے نقطۂ نظر سے کرنا ہے۔ ہم صرف وہی خواہش پوری کر سکتے ہیں جو دُرست اور انصاف پر مبنی ہو''۔[18]

جب ہم اپنے احساسات اور افکار کے غلام بنتے ہیں تو ذہنی انا کو تقویت ملتی ہے۔ اگر ہم اپنے احساسات اور افکار سے ہی اپنے آپ کو جوڑ لیتے ہیں تو ہم اپنے ہی عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ہم بے جا تفاخر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بے جا تفاخر کا شکار آدمی اگر عاجزی بھی اختیار کرے تو اُس کے لئے اور دنیا کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اپنے ہی عشق میں مبتلا آدمی دوسروں کو تکلیف اس لئے دیتا ہے کہ اُس کا احساسِ کبریائی تسکین پا سکے۔ تاہم یہ احساسِ تفاخر کی خام شکل ہے۔

خود پرستی اور احساسِ کبریائی کی ''نفیس اور مہذب'' شکل اُس وقت سامنے آتی ہے جب انسان تعریف اور ستائش کی غرض سے انسانی خدمت اور اعلیٰ اخلاقی معیارات پر قائم و دائم نظر آنا چاہتا ہے۔ بہت سے معاملات میں ہمارا انحصار دوسرے لوگوں پر ہوتا ہے اور اُن کی تعریف سے ہی ہماری اناؤں کا دانہ پانی چلتا ہے۔

Marfat.com

ذہنی انا کو لگام دینا جسمانی انا کو رام کرنے کی نسبت خاصا مشکل کام ہے۔ یہ جسمانی انا کی نسبت لطیف تر ہے اور ہماری شخصیات کا حصہ بن چکی ہے۔ ذہنی انا کو زیر کرنے کے لئے ہمیں چاہیے کہ ہم، ایماندار لمحات میں، اپنی ذہنی خواہشات کو تجزیہ و تحلیل چھلنی میں چھانیں۔ تاکہ ہمیں اس بات کا احساس ہو سکے کہ ہماری ذہنی انا کو کیا چاہیے اور کیا نہیں۔ اخلاقی ارتقاء کے راستوں پر چلنے کے لئے پہلے پہل ہمیں قدرتی طور پر اطمینانِ ذات کی ضرورت ہوگی۔ لیکن غلو پسندی اور مغالطہ ہماری روحانی ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ ہم جس قدر ذہنی خود پرستی پر قابو پانا سیکھتے ہیں اُسی قدر نیکوکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ذہنی انا پر قابو پانے کے لئے خُدا شناس ہونا لازم ہے۔ کیونکہ اُس نے ہی ہمیں اچھی صفات سے مزین کیا ہے۔ اُس نے ہی ہمارے اندر لامحدود امکانات کی دنیا آباد کی ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے تو خدا کے علاوہ ہمارے لئے کوئی بھی باعث افتخار نہیں رہتا۔ کیونکہ جو کچھ دیا ہے اُس نے دیا ہے۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے جھکنا ہمیں انکسار اور عاجزی سے مالا مال کرتا ہے۔ عجز وانکساری کے اس درس پر ہم اُس وقت عمل کرتے ہیں جب ہم ہر فکر اور ہر عمل میں اپنے آپ کو بھول کر صرف اُسے یاد رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُس وقت:

''عام رجحان اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہے۔ لیکن اس سے دو روحوں کے درمیان دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ روح کی منزل اور خوشی اتصال ہے۔ کاروبارِ دنیا میں اور زندگی کے ہر پہلو میں انضمام اور ہم آہنگی کو اپنا شعار بنائیں۔ صرف اسی طرح آپ اپنی زندگی کا حق ادا کر سکتے ہیں''۔ [19]

اس طرح ہم روحانی ترقی کے راستوں پر چل سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ہر قدم پر نفس کثیف کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمارا نفس ہر بار نیا بھیس بدل کر آئے گا۔ ہم نے اُسے پہچاننا ہے اور زیر کرنا ہے۔ یہی کچھ حضرت عنایت خانؒ نے Gayan میں کہا ہے:

''میری شرم! میری عاجزی! تو ہی وہ پردہ ہے جس نے میرے نفس کو چھپا رکھا ہے''۔ [20]

اس لئے ہمیں اس چھپے ہوئے دشمن سے خبردار رہنا ہے۔ کیونکہ جونہی ہمارے اندر احساسِ تفاخر جنم لیتا ہے ہم محدود ہو جاتے ہیں۔ ہمارا رابطہ الوہی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ جب ہم ذہنی انا کو لگام دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو روحانی انا برقرار رہتی ہے۔

Marfat.com

روحانی انا کیا ہے؟ یہی اصل انا ہے! ہم جانتے ہیں روح فی الحقیقت خدا سے جدا نہیں ہے۔ بلکہ اُس سے متصل ہے۔ خدا اور روح ہم جنس ہیں۔ اس لئے بعض اوقات یہ احساس بھی انسان کو احساس برتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسانی روح اور خدا میں مغائرت نہیں ہے۔ اس لئے ہم خدا ہونے کے فریب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں دیکھنا چاہیے کہ سمندر اور بلبلہ ایک سہی۔۔ لیکن سمندر کی شان وشوکت اور بلبلے کا اختصار سب پر ظاہر ہے۔[21]

اس لئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اپنے جسم اور ذہن کے آئینوں کو صاف کرنے کے بعد بھی۔۔ اس بات کو جاننے کے بعد بھی کہ انسان کی روح خدا سے آئی ہے اور خدا اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ ہمیں ایک قدم اور اٹھانا ہوتا ہے۔ یہ قدم دراصل آخری زقند ہے۔ یہ خدا کے بحرآسا شعور میں ڈبکی لگانا ہے۔ ڈوب جانا اور مٹ جانا ہے۔ یہی اخلاقی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اس کے بعد منزل آجاتی ہے اور سالک پکار اٹھتا ہے:

''میں نہیں۔ سب تُو ہے''۔[22]

یا جیسا کہ زرتشت کے مقدس صحائف میں لکھا ہے:

''تمہارے نام پر ہی زرتشت اپنی ہستی اور ذات قربان کرتا ہے''۔[23]

فنا دراصل مادی انا کا قربان ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تیسرا اخلاقی مرحلہ بھی ہے جسے ''قانونِ ترک'' (law of renunciation) کہتے ہیں۔ اس اخلاقی مرحلے پر من وتو کا عالم مٹ جاتا ہے اور ''تیرا'' اور ''میرا'' کی تکرار ختم ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر سالک ہستی کا راز پالیتا ہے جس میں وہ ہر طرف سے گھرا ہے۔

Marfat.com

باب 10

صوتی ارتعاش اور تصوف

اس کتاب کے پانچویں باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کائنات مختلف قسم کے ارتعاشات کا مجموعہ ہے۔ان ارتعاشات میں صوتی ارتعاش (sound) تخلیق اور انسانی زندگی میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔صوتی لہریں ارتعاشِ لطیف کی ایک قسم ہیں اور لطافت کے اعتبار سے روح سے خصوصی قُربت رکھتی ہیں۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ''وحدہ'' ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں روح، جو شیدائے حسن مطلق ہے، جب عالمِ مادیات کی طرف سفر کا آغاز کرتی ہے تو یہ صوتی ارتعاش سے ملتی جلتی ہے۔اظہار کے دوسرے مرحلے پر، جسے وحدانیات کہا گیا ہے، روح شعور مطلق کے ارتکاز کی وجہ سے انفرادیت کے احساس کو جنم دیتی ہے۔اس کے بعد اُس نور کا جنم ہوتا ہے جس نے جہانِ مظاہرات کو روشن کرنا ہے۔[1]

اس طرح غیر مرئی، غیر محسوس اور قوتِ ادراک سے بالاتر زندگی کا احساس جاگتا ہے۔ سب سے پہلے اِسے سنا جاسکتا ہے۔اور بعد ازاں اسے دیکھا جاسکتا ہے۔اس طرح زندگی کی ہر شکل ان مراحل کو طے کرنے کے بعد سامنے آتی ہے۔[2]

حضرت عنایت خانؒ سلسلۂ تخلیق میں صوتی ارتعاش کی اہمیت پر خاصا زور دیتے ہیں:

''آواز خود اپنے ہونے کی دلیل ہے۔یہ شعور کو اپنی موجودگی کا احساس خود دلاتی ہے۔کیونکہ یہ خود شعور کا حصہ ہے۔آواز شعور ہی ہے جو سنائی دِینے لگا ہے۔جاننے والا خود جان لیا گیا ہے۔عالم اور معلوم کے درمیان دیوار گرگئی ہے۔بالفاظِ دیگر شعور خود اپنی آواز کی گواہی دے رہا ہے''۔[3]

Marfat.com

عہد نامہ جدید میں لکھا ہے:

''ابتداء میں لفظ تھا۔ لفظ خدا کے ساتھ تھا۔ اور وہ لفظ خدا تھا''۔[4]

لیکن یہ لفظ مجرد آواز سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس لفظ کا ارتعاش اس قدر لطیف تھا کہ اِسے کان نہیں سن سکتے تھے۔ کائنات میں اس ارتعاش کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے صرف گہرے مراقبے میں باطنی کانوں سے سنا جا سکتا تھا۔[5]

آواز کے بعد روشنی کی باری آتی ہے۔ یہ دو قسم کے ارتعاشات اپنے آپ کو مختلف انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔ روشنی اپنے آپ کو آنکھوں پر وا کرتی ہے اور سہ پہلوی (three-dimensional) دنیا میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہو کر مادی دنیا کے واہمے کو حقیقت کے رنگ میں نہلا دیتی ہے۔ روشنی کے برعکس آواز کا مادی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ، روشنی کے برعکس، مادے کو نہیں روح کو نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے آواز کا، روشنی کی نسبت، روح سے گہرا تعلق ہے۔

جواکم ایرینیسٹ اپنی معروف کتاب The World of Sound میں قوتِ سماعت کو yin کہتا ہے، جو بلحاظِ جنس مادہ ہے، اور بصری صلاحیتوں کو yang کہتا ہے، جو جنسی لحاظ سے نر ہے۔[6]

تاہم اس میں صرف تشدید اور لہجے کا فرق ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''آواز اور رنگ کے مابین گہرا رشتہ ہے۔ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ یہ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ زندگی روشنی ہے اور روشنی زندگی ہے۔ اسی طرح رنگ آواز ہے اور آواز رنگ ہے۔ جب آواز رنگوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تو دکھائی دینے لگتی ہے۔ جب رنگ صوتی ارتعاش کا ''روپ'' دھارتا ہے تو قابلِ سماعت ہو جاتا ہے''۔[7]

اس کے بعد وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں:

''زندگی نہ صرف قابلِ دید ہے بلکہ قابلِ سماعت بھی ہے۔ لیکن کہاں۔۔۔ باطنی دنیا میں۔ جہاں ہم زندگی کا دیدار کر سکتے ہیں''۔[8]

خارجی دنیا میں ہم روشنی اور رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں۔ صوتی ارتعاشات اور رنگ الگ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ہماری حسیات مختلف فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ کان اُن لہروں کا پتہ

دیتے ہیں جن کا طول انہیں قابلِ سماعت بنا رہا ہوتا ہے۔ آنکھیں اُن ارتعاشات کی خبر دیتی ہیں جن کی موجیں انہیں آنکھ پر ظاہر کر رہی ہوتی ہیں۔ لیکن وہ جو مراقبہ کرتے ہیں۔ جو اپنے باطن کی گہرائی میں اُتر رہے ہیں۔ جو ارتکاز و استغراق کی منازل طے کر چکے ہیں زندگی کے سرچشموں کو جان گئے ہیں۔ وہ جان گئے ہیں کہ حواسِ خمسہ کے پیچھے ایک ہی حس ہے جسے ہم اپنی ہستی کا مرکزہ کہہ سکتے ہیں۔[9]

1۔ ہم آہنگی اور تخلیق:

مختلف آوازوں کا متوازن ملاپ اور سنگم تناسب، ہم آہنگی اور حسن پیدا کرتا ہے۔ حسن ہم آہنگی ہے اور ہم آہنگی حسن ہے۔ ہماری روح، اپنی اصل میں، شیدائے حسن مطلق ہے اس لئے اسے ہم آہنگی، حسن اور توازن سے پیار ہے۔ ہم آہنگی اور تناسب دنیا میں خدا کی جھلک ہے۔ تمام سلسلۂ تخلیق ہم آہنگی کے اصولوں پر قائم ہے اور اس کی منزلِ مقصود بھی ہم آہنگی اور توازن ہے۔

> ''ہم آہنگی رازِ تخلیق ہے۔ اصولِ تخلیق ہے۔ خدا ہم آہنگی، توازن اور حسن ہے۔ اس لئے انسان اُس سے پیار کرتا ہے۔ اس میں لوٹ کر جانا چاہتا ہے''۔[10]

ہم اس توازن اور ہم آہنگی کا تجربہ فطرت کے حسن میں کرتے ہیں۔ دیکھیں! پرندے گا رہے ہیں۔ ناچ رہے ہیں۔ پتوں کی سرسراہٹ میں ترنم ہے۔ موسیقی ہے۔ توازن ہے۔ حسن ہے۔ آفاقی ساز مسلسل بج رہا ہے اور درخت جھوم رہے ہیں۔ کیف و مستی کا اظہار کر رہے ہیں۔ فطرت کثافتوں سے پاک ہے اور ہمیں مختلف رنگوں کا ترنم ''سنائی'' دے رہا ہے۔ ہمارے حواس ہم پر ہر طرف ہم آہنگی اور توازن کا راز فاش کر رہے ہیں۔

دور بعد از عصر جدید (postmodern age) میں سائنس کو حیران کن بصیرت حاصل ہوئی ہے جس نے بے لچک منطق پرستی کو اپنی موت آپ مار دیا ہے۔ آج کے سائنس دانوں نے کائنات کے کہنہ رازوں کو بے نقاب کیا ہے تو وہ سانس لیتی ہوئی ہم آہنگی اور توازن تک پہنچے ہیں جسے انہوں نے ''کروی ترنم'' کہا ہے۔ ہم ان سائنسی شواہد پر اس کتاب کے پانچویں باب میں بات کر چکے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ آواز غیر مرئی ''مظہر'' ہے۔

Marfat.com

صوتی ارتعاش یا آواز کا انحصار مرتعش معروض میں ارتعاشات کی فی سیکنڈ تعداد پر ہے۔ تاہم اگر دھیمے سُروں کا ارتعاش (1:2 کے تناسب میں) زیادہ متوازن اور مترنم ہے۔ اور یہی تناسب تخلیقی تناسب کے قریب تر ہے۔ سات سُروں میں پانچواں سُر، جس کا تناسب 2:3 ہے اور چوتھا سُر جس کا تناسب 3:4 سلسلۂ تخلیق کے سُر معلوم ہوتے ہیں۔[12]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کائناتِ صغریٰ (کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ یا لہر) اور کائنات کبریٰ (کائنات بمعنیٰ مظہر کُل) ترنم اور توازن کے اُن اصولوں پر قائم ہے جسے انسان کے ذوقِ جمال نے بے نقاب کیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ خدا اور روح ہم جنس ہیں۔ خدا حسنِ مطلق ہے اور روح شیدائے حسنِ مطلق۔ اس لئے ذوق جمال انسان کا خمیر ہے۔ اور یہی وجہ ہے انسان کے ذوقِ جمال نے رازِ کائنات کو سائنسی آلات سے پہلے پالیا تھا۔

ایٹم، جسے مادی کائنات کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا رہا ہے، سات غلافوں پر مشتمل ہے جن میں الیکٹرانز اپنے مرکز کے گرد طواف کرتے ہیں۔ نظریہ مُقادیر (quantum theory) کے مطابق الیکٹرانز صرف اسی خول میں گردش کرتے ہیں جو اپنے مرکزے سے، جیومیٹریکل سکیل کے مطابق، 1, 4, 9 انگسٹرام * کے فاصلے پر ہوں۔ ان غلافوں کی تعداد 2) 2, 8, 18, x 2) کے تناسب سے بڑھتی ہے۔

اسی طرح ان الیکٹرانز کی رفتار کا تناسب 12 سے 6 اور 4 سے 3 ہے۔ علمِ موسیقی اور جمالیات کے ماہرین اس بات سے واقف ہیں کہ یہی مترنم اور کومل سروں کا ملاپ ہے۔ اور کائنات کی مدھر دھن بھی انہی سُروں سے ترتیب دی گئی ہے۔[15]

مندرجہ بالا گفتگو اعداد کی پراسراریت اور جادو کا پتہ دیتی ہے۔ اور کائنات کی تخلیق کا راز توازن اور ہم آہنگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کائناتِ کبریٰ (macrocosmos) میں ہر ایک سیارہ اپنے مرکز سے تقریباً اسی متوازن فاصلے پر گردش کر رہا ہے جو ہمیں کائناتِ صغریٰ میں الیکٹرانز اور مرکزے کے بیچ نظر آتا ہے۔ اور ایک بار پھر ہم یہ جان کر حیران ہو جاتے ہیں کہ کائنات کا پہیہ، ہر سطح پر، توازن اور ہم آہنگی کے اصولوں کے مطابق گردش کر رہا ہے۔[16]

---

* انگسٹرام۔ سویڈش ماہرِ طبیعات انگسٹرام کی دریافت کردہ اکائی جو ملی مائیکروں کا دسواں اور سنٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہے۔ مترجم

کائنات میں جزوی وکلی ہم آہنگی کے رازوں کی رمز کشائی کے بعد ہی ہم جان پاتے ہیں کہ عظیم سائنس دان، ماہر فلکیات اور مفکر Berendt اس نتیجے پر کیسے پہنچا تھا کہ:

''کائنات کا مقصد ہم آہنگی ہے''۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سیاروں نے اپنی ابتداء سے گردش کا انداز نہیں بدلا۔ یوں لگتا ہے کہ گردش کے کروڑوں امکانات میں سے انہوں نے، کروڑوں سالوں میں، حرکت کے موجودہ امکان کو دریافت کیا ہے۔[17] وہ مزید لکھتا ہے کہ ان سیاروں کو اپنی گردش میں ترنم پیدا کرنے میں کروڑوں برس لگے ہونگے۔ اور فطرت کی دنیا میں ہر درخت، ہر پودہ مقررہ اصولوں کی روشنی میں اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں اُس کا ہر بیج نیا درخت پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس لئے خالق کی تخلیق کردہ کائنات مختلف اشیا کے ہم آہنگ رشتوں کا شاہکار ہے۔ یہ ہم آہنگی تخلیق کی وحدت کا اعلان ہے۔ تخلیقی قوت انتشار اور بے ربطگی کے رجحانات سے مسلسل برسرِ پیکار ہے۔ کائنات کی تمام مخالف اور متصادم قوتوں کو یکجا اور باربط کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سب قوتیں مشیت ایزدی کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔

موسیقی اور کائنات کے رشتوں کو حضرت عنایت خانؒ نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

''موسیقی کائنات کی ہم آہنگی کا مختصر مگر جامع پیمانہ ہے۔ اور کائنات کی ہم آہنگی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اور موسیقی ترتیب دینے والی فاضلِ روزگار ہستیاں بھی جامع ہم آہنگی کی متلاشی ہوتی ہیں''۔[18]

2۔ آواز اور انسانی زندگی:

حضرت عنایت خانؒ موسیقی اور کائنات کے رشتوں پر بات جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''انسان کائنات صغریٰ ہے۔ انسان کی نبض اور دل کی دھڑکن ہم آہنگی کا شاہکار بھی ہو سکتی ہے اور بے ربط بھی۔ انسان کے دل کی دھڑکن کا مذہب ترنم اور ردھم ہے۔ اُس کی صحت اور بیماری، اُس کی خوشی اور غم۔۔ اُس کی زندگی میں ردھم کی موجودگی یا عدم موجودگی کا پتہ دیتا ہے''۔[19]

درج بالا اقتباس سے ہم آواز اور زندگی کے گہرے رشتوں کا سراغ پاتے ہیں۔ ہماری آواز بھی صوتی ارتعاش کی ایک شکل ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کے نزدیک انسانی آواز زندگی کی

علامت ہے کیونکہ اس کا ماخذ سانس ہے۔ آٹھویں باب میں ہم سانس کی روحانی اہمیت کو جان چکے ہیں۔ سانس روح اور جسم کے درمیان رشتہ قائم کرتی ہے۔ یہ وفورِ حیات ہے۔

اس لئے ہمارے الفاظ بامعنی اور طاقت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں ہم بغیر سوچے سمجھے کئی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی معنویت اور تاثر کو ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ الفاظ نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اگر اُن کا اشارہ کسی مثبت چیز کی طرف ہوتا ہے تو ان سے ہم مثبت توانائی حاصل کرتے ہیں۔ اگر اِن کا اشارہ منفی چیز کی طرف ہو تو ہم پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس طرح الفاظ ہماری زندگی کی راہیں متعین کر سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے الفاظ کے نفسیاتی اثرات کے حوالے سے خبردار رہیں اور اُن کا مثبت استعمال کریں۔

ہم اس وقت تک یہ بھی جان چکے ہیں کہ بعض الفاظ (مقدس الفاظ۔ اسمائے حسنٰی) روزمرہ الفاظ سے زیادہ طاقتور اثر کے حامل ہیں۔ الفاظ کی طاقت کا انحصار قوتِ ہستی پر ہے جو پس پردہ کارفرما ہوتی ہے۔ ان کی طاقت کا انحصار احساس اور فکر کی گہرائی پر ہے۔ اس نقطے کو واضح کرنے کے لئے حضرت عنایت خانؒ ایک مرید کی کہانی سناتے ہیں جس نے اپنے مرشد کے پاس آ کر فلسفیانہ سوالات کرنا شروع کر دیے۔ مرشد اُس وقت گہرے مراقبے میں تھا۔ وہ کوئی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے مرید سے کہا:

''خاموش!''۔

یہ لفظ اس قدر گہرے اخلاص اور احساس کا حامل تھا کہ مرید فوراً خاموش ہو گیا اور باقی ماندہ زندگی خاموش رہا۔ وہ دوبارہ کبھی نہ بولا۔ تاہم اُس کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا جب اُس کی خاموشی ہی اُس کی آواز بن گئی۔ اُس کے خاموش افکار ظاہر ہونے لگے۔ اُس کی خاموش آرزوئیں پوری ہونے لگیں۔ اُس کی ایک نظر سے مریض صحت یاب ہونے لگے۔ اُس کی نگاہ پڑتے ہی لوگوں کی تقدیریں بدلنے لگیں۔ اُس کی خاموشی زندہ ہو گئی۔[20]

ہمارے منہ سے نکلنے والے الفاظ بہت طاقتور ہو سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے الفاظ شعوری طور پر مثبت مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ اس کے لئے ضبطِ گفتار کی طویل ریاضت درکار ہے۔ اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنے الفاظ کو کیسے استعمال کریں اور ان کی سمت کا تعین کیسے ممکن ہے؟ ہم اپنے الفاظ کس مقصد کے لئے استعمال کریں؟

Marfat.com

سب سے پہلے ہمیں، حضرت عنایت خانؒ کے الفاظ میں، یہ احساس بیدار کرنا ہے کہ ہماری آواز روح کا پیرایۂ اظہار ہے۔[21] ہم، اپنے الفاظ کے توسط سے وہ کچھ بیان کرتے ہیں جو ہماری روح پر منعکس ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لئے صرف ضبطِ گفتار ہی کافی نہیں۔ ہمیں اپنے خیالات اور احساسات کو بھی قابو میں رکھنا ہے۔ اور اس قابل ہونا چاہیے کہ اپنے موڈ کو مطلوبہ سمت عطا کر سکیں۔ بصورتِ دیگر دوستانہ الفاظ قوتِ ترغیب سے محروم ہو جائیں گے۔ ہماری آواز ہمارے احساسات کا ساتھ نہیں دے گی۔ ہم اپنی آواز کو باد پیما کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اپنی آواز کا تجزیہ کرنے سے۔۔ اسے سن کر۔۔ ہم اپنی روح کی حقیقت جان سکتے ہیں۔[22]

اس کے علاوہ ہم اپنی آواز کو روحانی ریاضتوں کے دوران استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے ہم اپنے شعور کو گہرا کر سکتے ہیں۔ ہم اس کتاب کے آٹھویں باب میں مقدس الفاظ پر بات کر چکے ہیں۔ بلاشبہ اگر ہم اپنے افکار اور خیالات کو مقدس الفاظ پر مرکوز کر دیں تو ہمارے افکار و کردار پر اُن کا گہرا اثر مرتب ہو گا۔ لیکن ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا ان کے مثبت اور طاقتور ارتعاش کو بیدار کرتا ہے اور ہماری ریاضتوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

یہ باطنی زندگی میں الفاظ کا استعمال ہے جس سے ہم حقیقی طاقت حاصل کرتے ہیں۔ خارجی زندگی میں الفاظ کے دُرست استعمال سے ہم آہنگی جنم لیتی ہے۔ اس طرح ہم کائنات کے ہر ذرے۔۔ ہر لہر کی تال سے تال سے ملا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ہماری زندگی حزن و ملال سے پاک ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے حضرت عنایت خانؒ کا حوالہ دیا کہ انسان کی خوشی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زندگی کے بنیادی قانون (ردھم) سے ہم آہنگ ہے۔ اور اُس کا غم اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی فکر اور عمل اس بنیادی قانون کی پابندی نہیں کر رہے۔ حضرت عنایت خانؒ آگے چل کر فرماتے ہیں:

> ''روحانی خزانوں کا حصول اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب ہم یہ راز پا لیتے ہیں کہ کائنات ایک ہم آمیز۔۔ ہم صوت نغمہ ہے۔ ترانہ ہے۔ کائنات میں ہر فرد ایک سُر ہے۔۔ ایک ساز ہے۔ انسان کو خوشی اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ کائنات کے اس نغمے سے موافقت اور ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ جب وہ زندگی کا نغمہ ہر ذرے سے سُر ملا کر گاتا ہے''۔[23]

Marfat.com

لیکن یہ ہم آہنگی۔۔ہم صوتیت کس طرح ممکن ہے؟ زندگی میں ہماری ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے جن سے متفق ہونا ناممکن ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں کہ فہم وادراک کی کشادگی کے بغیر ہم آمیزی اور ہم آہنگی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم بے لچک اضداد کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائیں گے۔ ہم فراموشی (unlearning) کے صوفیانہ راستے پر چلتے ہوئے روایتی اچھائی میں بُرائی اور بُرائی میں اچھائی نہیں دیکھ پائیں گے۔[24]

حضرت عنایت خانؒ موسیقی کے موضوع پر لکھی ہوئی اپنی معروف کتاب میں فرماتے ہیں:

''انسان جو کچھ سیکھتا ہے۔۔اُس کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے کیونکہ سیکھنا ذہن پر کندہ کاری کرنا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ گہرے نقوش کیسے مٹا سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ جو کچھ ہم نے سیکھا ہے اُس کی تکمیل اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اُسے بھلا نہ دیں۔ کسی آدمی کو دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ آدمی مکار ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں (کیونکہ معاشرے نے مجھے یہ بتایا ہے کہ وہ آدمی بُرا ہے) سماج کے دیے ہوئے علم (learning) کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس آدمی کو ایک بار پھر دیکھنا اور اُس میں اچھائی تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔۔اُسے پسند کرنے لگنا اَن سیکھنا یا فراموشی ہے۔ جب آپ کسی ایسے شخص میں اچھائی دیکھ لیتے ہیں جسے آپ نے بدکار قرار دیا تھا آپ نے سماج کی آنکھوں کی بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ نے اضداد کے پردوں کو تار تار کرنا شروع کر دیا ہے۔ آپ نے ایک گرہ کھول دی ہے۔ انسان ایک آنکھ سے دیکھ کر سیکھتا ہے۔ اس کے بعد انسان دوسری آنکھ کا استعمال کرنا شروع کرتا ہے (unlearn کرتا ہے) اور اپنے بصری نظام کا مکمل استعمال کرنے لگتا ہے''۔[25]

یہ ایسا سفر ہے جو دوئی کی کثافتوں سے شروع ہو کر وحدت کی لطافت پر ختم ہوتا ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں اسے کائنات کے بنیادی سُروں سے سُر ملانا کہا جا سکتا ہے۔ مذہب کی اصطلاح میں یہ مشیتِ خداوندی کے آگے جھک جانا اور ہوائے نفس کی موت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہر انسانی عمل ایک نغمہ بن جاتا ہے جو پورے آرکسٹرا کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ جس میں

Marfat.com

ہر جِلت کائنات کے بنیادی سروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کیونکہ موسیقی۔۔مترنم صوتی ارتعاش۔۔اصول ہائے زندگی سے مکمل ہم آمیزی اور ہم آہنگی کی جھلک ہے۔موسیقی سے انسان زندگی کے سرتال سے ہم آہنگ ہونے کا فن سیکھتا ہے۔[26]

تمام فنون ہائے لطیفہ میں موسیقی خاص روحانی قدر کی حامل ہے۔کیونکہ موسیقی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے انسان سوچ سے آزاد ہو کر آفاقی ارتعاش میں کھو جاتا ہے۔اور اس لئے موسیقی باہیئت (form) اور بے ہیئت (formless) کے خلیج پر قدرت کا تعمیر کردہ ایک پل ہے۔[27]

اس لئے موسیقی تصوف میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔خاص طور پر سلسلۂ چشتیہ، جس سے حضرت عنایت خانؒ کا تعلق ہے، موسیقی کے روحانی فضائل پر خصوصی زور دیتا ہے۔سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کے مطابق زندگی ایک ساز ہے۔۔ایک نغمہ ہے۔اس لئے حضرت عنایت خانؒ موسیقی کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ’’خطوط اور رنگوں کا حسن ترتیب بہت دور لے جا سکتا ہے۔۔لیکن ایک حد تک۔خوشبو کی بھی ایک حد ہے۔لیکن موسیقی ہماری ہستی سے کلام کرتی ہے۔اور نئی زندگی کو جنم ملتا ہے۔ایسی زندگی جو ہستی کو بلندی اور عرفان سے ہم کنار کرتی ہے۔موسیقی زندگی کو تکمیل کے اُن درجات سے ہم آہنگ کرتی ہے جہاں انسان زندگی سے وہ کچھ پا سکتا ہے جو کچھ زندگی اُسے دے سکتی ہے‘‘۔[28]

دوسرے باب میں ہم نے حضرت عنایت خانؒ کی سوانحِ حیات سے اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ موسیقی کی بدولت وہ چند لمحوں میں مراقباتی بلندیوں کو چھونے لگتے تھے۔صرف حضرت عنایت خانؒ ہی نہیں۔۔اُن کو سننے والوں کے رابطے بھی عالمِ مظاہرات سے کٹ جاتے تھے۔اس کے بعد آپ کیف و سرور میں ڈوب جاتے اور ایک روحانی مستی انہیں گھیر لیتی۔[29]

Marfat.com

باب 11

روحانی اور جسمانی صحت

حضرت عنایت خانؒ موسیقی کو کائناتی ہم آمیزی اور ہم آہنگی کا مصغر قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ انسان کا دل اور نبض موسیقیاتی حسنِ ترتیب سے ہم آہنگ بھی ہو سکتے ہیں اور اس ترنم سے انحراف کا رجحان بھی رکھتے ہیں۔ تاہم ہماری دھڑکنوں کا ترنم، ہمارا ارتعاش، ردھم اور سُر ہماری بیماری یا صحت کا پتہ دیتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ انسان کی جسمانی صحت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''بیماری ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ ذہنی اور جسمانی صحت کا انحصار ہم آہنگی پر ہے۔ کیونکہ ذہن اور جسم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم آہنگی کا فقدان کیسے پیدا ہوتا ہے؟ ردھم اور ہم آمیز ارتعاش کی کمی سے!''۔[1]

اس موسیقیاتی تمثیل کی تشریح و توضیح کیسے ممکن ہے؟ ہم آمیز ارتعاش (سُر) سے مراد وفورِ حیات ہے۔ حیاتیاتی جوش وخروش کی کمی جسمانی اور ذہنی کمزوری پیدا کرتی ہے۔ ہر شخص مخصوص ارتعاش کا حامل ہے۔ ہر انسان کی سانس اس کے جسمانی ارتعاش کو قائم رکھتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا ارتعاش کائناتی ارتعاش سے ہم آہنگ رکھیں۔ جسم ایک مقدس آلہ ہے۔ صفائی، طہارت، پاکیزگی، صحت مند خوراک اس کی بنیادی ضروریات ہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ تنفس کا مخصوص روحانی ردھم قائم رکھنے سے ہم اپنے جسم کو توانا رکھ سکتے ہیں۔[2]

ذہنی سُروں کو خاص پیچ پر رکھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم زندگی میں پیدا ہونے والی نت نئی تبدیلیوں سے باخبر رہیں اور اُن کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتے چلے جائیں۔ ہم انتہائی جوش وخروش اور ہیجان پسندی سے بچے رہیں اور صدمات کو اپنے حواس پر طاری نہ ہونے دیں۔

Marfat.com

ذہنی سُروں کو خاص روحانی پیچ پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے موڈ میں استحکام اور ثابت قدمی لائیں۔

طبیعی معنوں میں ردھم سے مراد جسم میں خون کی باقاعدہ گردش ہے۔ ہمارے جسموں میں خون اپنے مخصوص انداز میں محوِ سفر رہتا ہے۔ نظامِ دورانِ خون کی باقاعدگی اور تسلسل صحت مندزندگی کی بنیادی شرائط ہیں۔ ہماری عادات کی باقاعدگی، کام اور آرام میں توازن زندگی کے ساز کا ردھم برقرار رکھتا ہے۔[3]

حضرت عنایت خانؒ ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ اگر یہ ردھم کسی نہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے۔۔ اس کا ازسرِ نو قیام ضروری ہے۔ زندگی کے ردھم کی تعمیرِ نو کے لئے احتیاط اور عملی بیداری سے کام لینا پڑتا ہے۔

ذہنی ردھم افکار اور خیالات کی پاکیزگی سے جنم لیتا ہے۔ اگر آپ کی فکر ہم آمیزی اور ہم آہنگی پر مرکوز ہے۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ذہن کو کائنات کے تعمیری ترنم سے ہم آہنگ کرلیا ہے۔[4] ذہن ایک مخصوص انفرادی رفتار کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کا ذہن سریع الرفتار نہیں ہوتا۔ تاہم ذہن کی مخصوص قدرتی رفتار کو قائم رکھنا اسے آفاقی ترنم سے ہم آمیز کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایک سوچ سے دوسری سوچ پر اچانک حملہ آور ہونے کے رجحانات کو قابو میں رکھنا ہے اور ذہن کو ارتکازی عادات سے مزین کرنا ہے۔ تاہم کسی ایک سوچ پر، آگے بڑھے بغیر، جم جانا۔۔ ٹھہر جانا ذہن کے دریاؤں کو متعفن کرنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ اپنی فکری صلاحیتوں کو ہر دم جوان رکھنا چاہتے ہیں تو فکر کا آگے بڑھنا لازم ہے۔[5]

اگر ہم جسم اور ذہن کو تندرست اور توانا رکھنا چاہتے ہیں تو اِن دونوں کے لئے کام اور آرام ضروری ہیں۔ صرف اسی طرح ان کا درست ردھم قائم رکھا جاسکتا ہے۔ ہمیں ذہنی اور جسمانی دولت کو کسی فضول خرچ بچے کی طرح خرچ نہیں کرنا۔ بلکہ کفایت شعاری سے کام لینا ہے۔ ہمیں اپنی ذہنی اور جسمانی توانائیاں اس جگہ صرف کرنی ہیں جہاں ان کا استعمال ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی ذہنی اور جسمانی توانائیوں کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام نہیں لیں گے تو ہم اعصابی تناؤ کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اعصابی تناؤ اور ادھیڑ بن کی ایک اہم وجہ بے ہوشی، تن آسانی، نشہ آور اشیا کا استعمال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جذباتی انتہاپسندی، بے جا حساسیت، غصہ اور منافرت جذبۂ حیات کو چاٹ جاتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کے بے سود اور تخریبی اصراف کا باعث بنتے ہیں۔[6]

Marfat.com

1۔ جسم اور ذہن کا رشتہ:

جسم اور ذہن کا کیا رشتہ ہے؟ حضرت عنایت خانؒ جسم اور ذہن کے رشتوں کی رمز کشائی کچھ یوں کرتے ہیں:

''جسم اور ذہن ایک دوسرے کے آمنے سامنے موجود ہیں۔ جسمانی ترتیب و تزئین کا عکس ذہن پر پڑتا ہے۔ اور اسی طرح جسمانی اعمال و اشغال ذہن کے صاف و شفاف یا گرد آلود ہونے کی خبر دیتے ہیں''۔[7]

مابعد از طبیعات میں پیرومرشد فرماتے ہیں:

''ذہن جسم پر قوی تاثرات مرتب کرتا ہے۔۔ جبکہ جسم ذہن پر صاف اور واضح اثرات مرتب کرتا ہے''۔[8]

تخیل ذہن کے خودکار اور آزاد عمل کا نام ہے۔ بیماری اور صحت سے قوتِ متخیلہ کا گہرا تعلق ہے۔ اس کی مدد سے ہم تکلیف، درد اور تھکاوٹ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ غلو پسندی تخیل کا مذہب ہے۔ اس کی مدد سے ہم بیماری پیدا بھی کر سکتے ہیں اور اُسے استقلال بھی بخش سکتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''سو بیمار لوگوں میں سے ننانوے ایسے ہیں جن کی بیماریاں قوتِ متخیلہ کی پیداوار ہیں۔ اگر اُن کا تخیل انہیں صحت مند ہونے کی اجازت دے تو وہ صحت یاب ہو سکتے ہیں''۔[9]

چنانچہ اگر کسی مریضانہ کیفیت پر تخیل کی نظرِ کرم نہ رہے تو ہم اُس بیماری سے نجات پا لیتے ہیں۔ حضرت عنایت خان مریضانہ تخیل کو منفی تخیل کہتے ہیں۔ جس کا کام بیماری ''تخلیق'' کرنا ہے۔ منفی تخیل کے برعکس مثبت تخیل کی مدد سے بھی تخیلاتی بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی ذہن کس قدر طاقتور ہے۔ اور ذہن کو قابو میں رکھنا صحت اور خوشی کی کلید ہے۔

اس لئے ہمیں منفی تصورات اور خیالات کی جگہ مثبت افکار و تصورات کو دینی چاہیے۔ ہمارا اعصابی نظام دراصل ہمارے افکار اور واہمات کا غلام ہے۔ عصرِ حاضر کے دماغی علوم اس

Marfat.com

حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ڈاکٹر دیپک چوپڑا اپنی معروف کتاب Quantum Healing میں لکھتے ہیں کہ دماغی ''ٹرانسمیٹرز'' کی رسائی جسم کے ہر کونے تک ہے۔اور یہ سریع الرفتار پیغام رساں اتنی تیزی سے جسمانی اور اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ روشنی بھی ان کی رفتار کا تصور نہیں کر سکتی''۔[10]

بلاشبہ فکر و خیالات کے اثرات کا دارومدار قوتِ ارادی پر ہے۔اس مقام پر لازم ہے کہ ہم فکر اور یقین میں فرق واضح کر دیں۔ایک شخص، یقین کے بغیر، سوچ سکتا ہے کہ وہ تندرست ہو جائے گا۔تاہم اگر یقین صحت مند ہو تو تریاق بن سکتا ہے۔لیکن یقین کی اس سطح کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔کیونکہ اکثر اوقات ہم یقین کرنے کے لئے شہادت یا دلیل طلب کرتے ہیں۔لیکن حضرت عنایت خانؒ کہتے ہیں:

''ایسا کرنا ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔۔لیکن یقین کی پختگی کے ساتھ یہ قلعے جنت بھی بن سکتے ہیں''۔[11]

یقین عقیدے کی معراج ہے۔یقین ہماری ہستی کے مرکزے سے پھوٹتا ہے۔یقین اس کیفیت کا نام ہے کہ جو کچھ میں مانتا ہوں وہی کچھ ہونے کو ہے۔یقین ایک قوی احساس اور مقوی جذبے کا نام ہے۔یقین اس حد تک مقدس ہے کہ اسکی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔اسے سکھا نہیں جا سکتا۔اس کا موتی انسان کو اپنے باطن میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔[12]

یقین رحمتِ خداوندی ہے۔ہم اس کے لئے اپنا سینہ کھول سکتے ہیں۔اپنی ہستی اس کے سپرد کر سکتے ہیں۔لیکن یقین کی دولت انہیں حاصل ہوتی ہے جو قنوطیت پسند نہیں ہیں۔جنہیں مایوسیاں گھیر نہیں سکتیں۔

ہمیں یقین کیوں پیدا کرنا چاہیے؟ یقین ہماری الوہی حقیقت کا بیان ہے۔ہماری روحانی قوت ہے۔یقین ذہن کی آنکھ ہے۔اس کے بغیر نہ ہم دنیوی زندگی میں کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے بعد۔چونکہ مادہ روح سے پیدا ہوا ہے۔اس لئے مادے پر روح کی حکمرانی ہے۔[13]

جب، گذشتہ صدی کے آغاز میں، حضرت عنایت خانؒ ہمیں یہ تعلیمات دے رہے تھے۔اس قسم کے خیالات میڈیکل سائنس اور سائنسی افکار کی ضد معلوم ہوتے تھے۔انہوں نے فرمایا تھا:

''آج کا انسان اس غلط فہمی کا شکار ہے روح مادے سے جنم لیتی ہے''۔

Marfat.com

تاہم آج کی میڈیکل سائنس صوفیانہ نکتۂ نظر سے ہم آہنگ ہو چلی ہے۔ڈاکٹر دیپک چوپڑا لکھتے ہیں:

''آج سے قبل سائنس کا خیال تھا کہ ہم طبیعی مشینیں ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح سوچنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔آج سائنس نے یہ مان لیا ہے کہ انسان زندہ فکر کا نام ہے جس نے طبیعی مشین بنانے کا فن سیکھ لیا ہے''۔[14]

2۔غیر طبی طریقۂ علاج:

مندرجہ بالا مباحث ہمیں غیر طبی طریقۂ علاج کی طرف لاتی ہیں۔حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''کوئی بیماری ایسی نہیں ہے جس کا کوئی علاج نہ ہو۔ہم کسی کی صحت اور شفا سے ناامید ہو کر خدا کی تخلیق پر شک کرنے کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دنیا کارخانۂ امکانات ہے۔یہاں سب کچھ ممکن ہے۔[14]

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے جسم کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں۔کیونکہ جسم خداوندِ کریم کی تخلیق ہے۔عالمِ مظاہرات، جسے ہم کائنات کہتے ہیں، دراصل سامانِ جلوۂ ذات ہے۔اُس کا ایک وسیلہ انسانی جسم بھی ہے جس کے ذریعے وہ ذات آرائش جمال میں محو ہے۔ بالفاظِ واضح تر۔۔خدا نے انسانی جسم کو خود اپنے تجربے کے لئے پیدا کیا ہے۔[16]

ہم اپنے جسم۔۔اس مقدس تخلیق کی حفاظت کیسے کر سکتے ہیں؟ حضرت عنایت خانؒ کا نقطۂ نظر متوازن اور مثبت ہے۔وہ فرماتے ہیں۔

''ایک طرف ہمیں اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔۔طبیعی سُر تال کا خیال رکھنا ہے۔ہمیں انتشار کی وجوہات کو جاننا ہے اور اپنے تخیل کو لگام دینا ہے تاکہ وہ ہماری بیماری کو بڑھا نہ دے۔۔اپنی بیماری کو بھلانے کی کوشش کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا''۔[17]

حضرت عنایت خانؒ علاج معالجے کے روایتی طبی طریقۂ کار پر متوازن آرا کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسے تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔اُن کے خیال میں جراثیم،

Marfat.com

بیکٹیریا اور وائرس کے خاتمے کے لئے زیرِ استعمال سائنسی طریقہ ہمیشہ متوقع نتائج کا حامل نہیں ہوسکتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ معروضی دنیا میں مضرِ صحت مخلوق موجود ہے۔ لیکن انسان کے لئے زیادہ مضرِ صحت اشیا موضوعی دنیا کی مکین ہیں۔مضرِ صحت اشیا کی موضوعی دنیا مریض کا ذہن، تصورات، عقائد اور توہمات ہیں۔ جب تک مریض یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیمار ہے وہ اپنے جسم کے بیمار حصوں کو تقویت دیتا ہے۔اگر اُس بیماری کے جراثیم مر بھی چکے ہوں تو بیمار قوتِ متخیلہ انہیں دوبارہ پیدا کر لیتی ہے''۔[18]

ڈاکٹر دیپک چوپڑا بھی حضرت عنایت خانؒ کے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ***Quantum Healing*** میں لکھتے ہیں:

''ویدک شاستروں میں لکھا ہے کہ جنگ خارجی دنیا میں نہیں باطنی دنیا میں ہورہی ہے۔ یہ بات روایتی جراثیمی نظریے کے خلاف ہے۔جس نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ حملہ آور معروضی دنیا سے آتے ہیں۔وہ ہر وقت ہم پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔لیکن صحت مند لوگ ان خارجی حملہ آوروں میں رہتے ہوئے بھی بھرپور زندگی گذارتے ہیں''۔[19]

ادویات کے حوالے سے حضرت عنایت خانؒ کا کہنا ہے کہ:

''کیمیائی یا غیر کیمیائی ادویات ہمیشہ کامیاب علاج ثابت نہیں ہوسکتیں۔ ان کے مضر اثرات ذہن اور دماغ تک کو متاثر کرسکتے ہیں۔ دوائیں ضروری ہیں لیکن انہیں اُن بیماریوں کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے جنہیں انسانی قوتِ ارادی ختم کرسکتی ہے''۔[20]

وہ آگے چل کر فرماتے ہیں:

''جس بیماری کا علاج ایک عام سی دوائی سے ممکن ہو اُس سے چھٹکارا پانے کے لئے ذہنی قوت کا استعمال ضروری نہیں ہے۔ذہنی طاقت کو زیادہ سنجیدہ مسائل کے حل کے لئے استعمال کیا جانا چاہیے۔اگر ہر بیماری کا ذہنی علاج مقصود ہوتا تو خداوندِ کریم حیات دوست جڑی بوٹیاں اور کیمیائی اجزاء پیدا نہ کرتا''۔[21]

Marfat.com

سرجیکل آپریشن بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں لیکن عام حالات میں، ان کے مضر اثرات کے پیش نظر، ان سے بچنا چاہیے۔

حضرت عنایت خانؒ بیماری پر قابو پانے کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اس پر ہم یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ کیا موت اور بیماری کو بھی خدا کی مرضی سمجھنا چاہیے؟ موت بیماری سے مختلف ہے۔ کیونکہ بیماری موت سے بدتر ہے۔ موت کا ڈنگ وقتی ہے۔ ایک شخص مادی دنیا سے چلا جاتا ہے یہ اتنا تکلیف دہ تصور نہیں ہے۔ لیکن بیمار ہونا ادھورا ہونا ہے اور ادھورا پن موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔

اس سے ہم عصرِ حاضر کی اہم ترین اخلاقی مباحث کی طرف آئیں گے۔ ان میں سے ایک سہل مرگی ہے جس میں لاعلاج بیماری میں مبتلا انسان کو بے ایذاء موت دینے کا طریقۂ کار شامل ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

> ''ایک ڈاکٹر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کسی مریض کو تکلیف سے بچانے کے لئے مار ڈالے۔ کیونکہ قدرت انسان سے زیادہ دانش مند ہے۔ جو انسان بھی زندہ ہے قدرت نے اُسے کسی نہ کسی مقصد کے لئے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہم انسان قدرت سے زیادہ جانکار نہیں ہیں۔ ہمیں انسان کی تکالیف دور کرنے کے لئے کوششیں کرنی ہیں''۔[22]

سرجیکل آپریشن بیماریوں کے علاج میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں لیکن اکثر اوقات یہ انسانی صحت پر بدترین اثرات مرتب کرتے ہیں۔[23]

اور اس کے علاوہ

> ''مصنوعی طریقۂ کار کے ذریعے انسان کو لمبے عرصے تک زندہ رکھنا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی قدرت کی دانش مندی کی خلاف ورزی ہے۔ یہ فعل اتنا ہی قابلِ مذمت ہے جتنا کہ کسی کو تکلیف سے بچانے کے لئے قتل کر دینا۔ انسان حدود فراموش واقع ہوا ہے۔ جب بھی انسان اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ اس کا خمیازہ اُسے ضرور اٹھانا پڑتا ہے''۔[24]

اگر کیمیائی اور قدرتی دوائیں، آپریشن اور سہل مرگی کے طریقہ ہائے کار محدود فوائد اور ضمنی نقصانات کا باعث ہیں تو اچھی صحت کے حصول کا کونسا طریقہ بہترین قرار دیا جا سکتا

ہے؟ بہترین دوا خالص غذا، صحت افزا خوراک، صاف ہوا، کام اور آرام میں توازن کا قیام، خیالات کی پاکیزگی، خالص احساسات اور خدا پر اعتماد ہے۔ کیونکہ ہم سب خدا سے منسلک ہیں اور اُسی کے قوتِ اظہار کی پیداوار ہیں"۔ [25]

3۔ روحانی علاج:

ذاتِ خداوندی پر اگر پختہ اعتماد پیدا ہو جائے تو ہمیں یقین عطیہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد روحِ عظیم ہماری ہر بیماری کے علاج کے لئے خود متحرک ہوسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے دُعا نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ کیونکہ دُعا کے بغیر ہم خدا سے باطنی رشتوں کا شعور نہیں پا سکتے۔ مراقبے کے دوران ہم خالص شعور اور روحانی طاقت کے حصول کو ممکن بناتے ہیں۔ اپنے اندر روحِ خالص کو جگاتے ہیں جو ہمیں روحانی وجسمانی بیماریوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ نے اپنی ایک غیر مطبوعہ کتاب میں اس بات کو کچھ یوں واضح کیا ہے:

> "مراقبہ ہماری تمام بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرئی زندگی کا ماخذ اس کا غیر مرئی سرچشمہ ہے۔ جسے ہم ذاتِ خداوندی کہتے ہیں۔ زندگی کا غیر مرئی سرچشمہ امن ہے۔ کامل سکون ہے۔ اس لئے امن اور کامل سکون سے بہتر علاج کوئی نہیں ہوسکتا۔ ادویات ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ لیکن ایک حد تک۔ مثال کے طور پر ادویات جسم کے لئے مفید ہوسکتی ہیں ذہن اور نفس (psyche) کے لئے نہیں۔ ادویات مادی و کیمیائی ہیں۔۔ اس لئے یہ روح پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ ادویات خارجی امداد فراہم کرتی ہیں لیکن مراقبہ علاج کا باطنی طریقہ ہے"۔ [26]

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر مظہر ارتعاش کی تجسیم ہے۔ الفاظ صوتی ارتعاشات ہیں اس لئے انسان کو دُکھ درد سے نجات دلا سکتے ہیں۔ صوتی ارتعاش سے موسیقی بھی مراد ہے۔ امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے حضرت عنایت خانؒ کے اس روحانی فلسفے کو سائنسی بنیادوں پر پرکھا۔ [27] اس ڈاکٹر کا نام ابرامز تھا جس نے مریضوں کو صحت یاب کرنے کے لئے برقی ارتعاشات (radionics) سے کام لیا۔ حضرت عنایت خانؒ ڈاکٹر ابرامز کا حوالہ کچھ یوں دیتے ہیں:

> "اُس کے تجربات کے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔ تاہم یہ طریقۂ علاج ہنوز تکاملی مراحل میں ہے۔ اسے بھرپور طریقۂ علاج کے طور پر سامنے

Marfat.com

آنے میں کم سے کم ایک صدی لگے گی۔ یہ ایک وسیع شعبۂ علم ہے اور ابھی
اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ ابھی اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لیکن امید کی
جاسکتی ہے کہ یہ طریقۂ علاج طبی دنیا میں انقلاب لا سکتا ہے"۔[28]

طبی دنیا میں اس طریقۂ علاج کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن بعد ازاں، خاص طور پر برطانیہ میں، اسے موثر طریقۂ علاج کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ویدک طب میں بھی صوتی ارتعاشات اور مراقبے کی مدد سے علاج معالجے کا کام جاری ہے۔ ڈاکٹر دیپک چوپڑا نے مہارشی مہیش یوگی کے اصرار پر ہندوستان کے قدیم ترین طریقۂ علاج کا سائنسی مطالعہ کیا ہے اور دنیا کو یہ بتایا ہے کہ ماورائی مراقبہ (transcendental meditaion)، جسے مغرب میں روحانی مسرت کے حصول کی تکنیک کہا جا رہا ہے، بنیادی صوتی ارتعاشات کی مدد سے انسان کو بہت سی بیماریوں سے نجات دلا سکتا ہے۔[29]

یہ تمام باطنی علاج کے ذرائع ہیں جن کے ذریعے رحیم و کریم روح اپنا علاج خود کرتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کہتے ہیں کہ باطنی طریقۂ علاج قوتِ ارادی کو مضبوط کرتا ہے اس لئے یہ خارجی طریقوں سے بہتر ہے۔[30]

لیکن اکثر اوقات ہمیں دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ ہمیں بتاتے ہیں کہ روحانی طریقۂ علاج کے ذریعے ہم دوسروں کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "ادویات کے ذریعے علاج اور روحانی طریقۂ علاج میں وہی فرق ہے
> جو ٹرین کے سفر اور ہوائی سفر میں ہے"۔[31]

صحت، ہماری جسمانی ہم آمیزی اور مترنم ارتعاش کی ہی ایک صورت ہے۔ ایمان اور مراقبہ انسان کے باطن میں ہم آہنگ ارتعاش جگاتے ہیں اور یہی علاج ہے۔ یہ ارتعاشات ہمارے اپنے ذہن اور جسم تک محدود نہیں رہتے۔ یہ دوسرے لوگوں پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ان کا رخ اُن لوگوں کی طرف کیا جا سکتا ہے جنہیں علاج کی ضرورت ہے۔ یہ ارتعاشات سانس کے ذریعے دوسروں تک منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ روحانی علاج کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

- مقدس الفاظ تحریر کرنا
- پانی میں مقناطیسی ارتعاش پیدا کرنا
- جسم کے متاثرہ حصے کو چھونا
- نظر ڈالنا
- صوتی ارتعاش
- ہمدردی
- دُعا

ارتعاش جسمانی فاصلوں سے آزاد ہے۔ اس لئے مریض کی غیر موجودگی میں بھی اُس کا علاج ممکن ہے۔ یہ ایک جداگانہ اور انوکھا طریقۂ علاج ہے۔[32]

مسکن اور شفا دینے والی سانس کی قوت کو حضرت عنایت خانؒ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''سانس ایک برقی بہاؤ ہے۔ اور برقی بہاؤ کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ برقی بہاؤ روحانی معالج اور مریض کے درمیان حائل فاصلوں کو پُر کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روحانی معالج کے لئے روحانی ارتقاء شرط ہے۔ اس کے بغیر قوتِ ارادی اور روحانی طاقتوں کا حصول ناممکن ہے۔ اور روحانی ارتقاء سے خدائی شعور مراد ہے''۔[33]

یہاں ہم اس بنیادی سوال کی طرف آتے ہیں کہ شفایاب کرنے والی روحانی طاقت کا حصول کس طرح ممکن ہے؟ ذیل میں روحانی ارتقاء پر عمومی روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ آٹھویں باب میں آپ تفصیل ملاحظہ فرما چکے ہیں۔۔ سانس کی طاقت روحانی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے۔ روحانی معالج کے لئے لازم ہے کہ وہ بلند ترین ذہنی اور شعوری منزل پا چکا ہو۔ اس منزل کو پانے کے لئے ارتکاز اور بیمار کے لئے ہمدردی اور محبت ضروری ہے۔ روحانی معالج کے لئے لازم ہے کہ اُس کی توجہ بیماری پر نہیں بلکہ صحت پر مرکوز ہو۔ ان شرائط میں سے سب سے اہم خداوندِ کریم پر کامل بھروسہ ہے کیونکہ روحانی معالج نے خدائی توانائیوں کا راستہ بننا ہوتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''جب معالج یہ سمجھتا ہے کہ وہ شفا دے رہا ہے۔ اُس کی طاقت ایک بوند کی مانند ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے کہ خدا شفا بخش رہا ہے۔ جب وہ اپنے

Marfat.com

آپ کو بھول جاتا ہے اور اُسے خدا ہی یاد رہتا ہے تو اُس کی طاقت سمندر بن جاتی ہے''۔[34]

پیرو مرشد مندرجہ ذیل اقتباس میں اس بات کو مزید واضح کر رہے ہیں:

''روحانی معالج کو یہ احساس اور یقین طاقت عطا کرتا ہے'' میں عارضی وجود ہوں۔ خدا ہی واجب الوجود ہے۔ صرف ذہی ہونے کی شرط پر پورا اترتا ہے''۔ یہی احساس اُسے لامحدود طاقت عطا کرتا ہے۔ یہ احساس کہ خدا ہی زندگی ہے اور خلاء، جو عام لوگوں کے لئے خالی جگہ ہے، اصل میں زندگی سے معمور ہے''۔[35]

صوفیائے کرام نے مختلف ادوار میں یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کو روحانی طریقوں سے شفایاب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عنایت خانؒ بھی نہ صرف روحانی طریقۂ علاج پر یقین رکھتے تھے بلکہ اُن کی دُعائیں دواؤں سے بھی سریع الاثر تھیں۔ تاہم بعد ازاں انہوں نے اپنی ساری توانائیاں تصوف کے پیغام کو عام کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ تاہم اُن کے کزن (مرشد علی خان) جو بین الاقوامی صوفی تحریک کے روحانی پیشوا رہے ہیں، ایک عظیم روحانی معالج تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کو دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان کی سانس، تزکیہ نفس کے باعث، بہت طاقتور تھی۔ انہیں غیر متزلزل ایمان کی دولت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک عظیم موسیقار بھی تھے۔

مرشد علی خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کوئی شفایاب ہونے کے بعد اُن کا شکریہ ادا کرتا تو وہ عاجزی سے ہاتھ اوپر اٹھا لیتے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے۔۔''اُس ذات کا شکریہ ادا کرو! اُس نے ہی مجھ مفلوج کو طاقت دی ہے''۔ مغرب میں شیدائے تصوف آج بھی اُس مسیحا صفت بندۂ خدا کو یاد کرتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ روحانی طریقۂ علاج پر اس قدر زور دیتے تھے کہ صوفی تحریک میں روحانی علاج معالجے کی باقاعدہ سرگرمیوں کا آغاز ان کی زمینی حیات کے دوران ہی کر دیا گیا تھا۔ ان سرگرمیوں میں مریض کی موجودگی یا غیر حاضری میں اُس کے لئے دُعا کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اسمائے حسنیٰ کا ورد، مراقبہ اور ذکر تجویز کیا جاتا ہے۔ صوفی دوست جانتے ہیں کہ یہ دکھی انسانوں کی غیبی اور عاجزانہ روحانی امداد ہے جو خدائی وسیلوں سے اُن کے درد کا مداوا کرتی ہے۔

Marfat.com

باب 12

عالمی امن، سماجی پہلو

1۔ باطنی امن:

گذشتہ ابواب میں حضرت عنایت خانؒ کی صوفی تعلیمات کا خلاصہ مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اس دوران حضرت عنایت خانؒ کے فلسفۂ تصوف، روح کے سفر، عالمگیر عبادت، صوتی ارتعاش کی اہمیت اور روحانی علاج معالجے پر بات ہوئی۔ یہ سب اس لئے تھا کہ ہم دنیوی بھول بھلیوں میں بھٹکے بغیر اپنا مقصدِ حیات تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس باب میں ہم اس بات پر غور کریں گے کہ تصوف کا پیغام ٹکڑوں میں بٹی ہوئی، محوِ تصادم اور مصیبت میں مبتلا دنیا کو امن اور عالمگیر وحدت کا تحفہ دے سکتا ہے یا نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرفان دل کے توازن کا نام ہے اور کثرت کا ظہور وحدت سے ہوا ہے۔ لہٰذا عارف وہ ہے جو من و تو کے عالم سے دور نکل آیا ہو۔ جس کی نظر میں سب یکساں ہو گئے ہوں اور جو دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے لگا۔ جو لا موجود الا اللّٰہ کی حقیقت کو پا گیا اور اس کے بعد اس قال کو اپنا حال بنا لیا۔ جو یہ راز جان گیا کہ کائنات میں اُس کے سوا کوئی موجود نہیں۔۔ اُس کے لئے ہر مظہر۔۔ ہر ہستی مقدس ہو گئی۔ صوفیائے کرام نے اس کیفیت کو حریت نفس کہا ہے۔ حریت نفس سے بڑی اور کوئی دولت اور نعمت نہیں۔ حضرت عنایت خانؒ گیان میں فرماتے ہیں:

> ''جس نے حریت نفس کی منزل کو پا لیا اسے دائمی خوشی اور ابدی سکون مل گیا۔ اُس نے خدائی شعور میں قیام پا لیا۔ بالفاظِ دیگر اُس نے دائمی امن پا لیا''۔[1]

Marfat.com

(Aphorisms) اقوالِ حکمت میں انہوں نے حریتِ نفس اور باطنی امن کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

''امن علم نہیں ۔۔ طاقت نہیں ۔۔ خوشی نہیں ۔لیکن ان سب کا حصول امن ہے۔۔ حریتِ نفس ہے۔ حریتِ نفس سے امن جنم لیتا ہے۔اور امن خوشی پیدا کرتا ہے۔ امن دیکھی اور اَن دیکھی دنیاؤں کے علم کا شوق بیدار کرتا ہے۔ باطنی امن کا حصول اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اپنے باطن میں روحِ عالم کو تلاش نہیں کر لیتا''۔[2]

تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ کو لگام کئے بغیر باطنی امن ۔۔ باطنی طمانیت کا حصول ناممکن ہے۔ حضرت عنایت خانؒ کی غیر مطبوعہ کتابوں میں The Book of Peace بھی شامل ہے۔[3] یہ کتاب نفسِ امارہ کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ فرماتے ہیں:

''دنیا میں خون بہایا گیا ہے تو اس کی وجہ نفس ہے۔ دنیا میں جنگیں ہوئی ہیں تو ان کی بنیاد بھی انسان کی انائے مقید ہے۔ اس لئے اگر قیامِ امن کو یقینی بنانا ہے تو نفس کو ۔۔۔ انائے مقید کو ۔۔۔ زیر کرنا لازم ہے۔ نفس کو رام کرنا نہ صرف انفرادی سطح پر ضروری ہے بلکہ اجتماعی سطح پر اس کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے''۔[3]

گذشتہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نفس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنی محدود ہستی کو ہی اپنا آپ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جب ہم اپنی ضروریات، جذبات، خواہشات اور ذہن کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اس لئے حضرت عنایت خانؒ ٹھیک کہتے ہیں کہ عالمی امن کا قیام انفرادی اور اجتماعی نفسِ امارہ کو قابو میں لائے بغیر ناممکن ہے۔ متذکرہ بالا کتاب میں حضرت عنایت خانؒ نے نفسِ امارہ کی چار اہم اقسام پر روشنی ڈالی ہے:

- انفرادی
- سماجی
- قومی اور
- مذہبی

Marfat.com

کسی خاص معاشرے میں رہتے ہوئے ہم اُس معاشرے کے محدود مقاصد اور تناظرات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو کسی خاص قوم کا فرد سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو دنیا سے الگ کر لیتے ہیں اور قومی و معاشرتی احساسِ تفاخر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات کسی خاص مذہبی گروپ میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہم مذہبی خود مرکزیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور مذہب کو نفرت کا مقدس اجازت نامہ بنا لیتے ہیں۔ ہم کسی مذہب کا دم اس لئے بھرتے ہیں تا کہ اس کے پردے میں منافرت کو چھپایا جاسکے۔ دنگا فساد کی حیوانی جبلت کو تقدس کا چوغہ پہنایا جاسکے۔ جنون کی اس دھند میں ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم اجتماعی نفسِ امارہ کے پجاری ہیں اور خدا کے دھوکے میں اپنی جھوٹی اناؤں کو پوج رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم نفسِ امارہ کی ہر قسم پر قابو پائیں اور اس کے دھوکے میں آئے بغیر اپنے آپ کو پہچانیں۔

اس کتاب کے نویں باب میں ہم نے انفرادی نفس پر بات کی ہے۔ حضرت عنایت خانؒ اپنی کتاب The Book of Peace میں اجتماعی نفس کی چیرہ دستیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے گذشتہ استدلال کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ نفس ایک ہرجائی جانور کی طرح ہے:

> ''کئی لوگ نفس کے خلاف بات کرتے ہیں۔ تقاریر کرتے ہیں۔ لیکن جب تک دل نفس کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ اور آواز دل سے نہ اُبھرے۔۔ زبان نفس کے قابو میں رہتی ہے۔ اگر زبان دل کی رفیق نہ ہو پائے تو نفس کے خلاف کی جانے والی تقاریر کا ہدف دوسروں کا نفس ہوتا ہے۔ اور اگر نفس اپنے ہی اوپر حملہ آور نظر آ رہا ہو۔۔ یہ خود کو کمزور کرنے کی بجائے تقویت پا رہا ہوتا ہے۔ یہی نفس کا دھوکہ ہے۔ اس لئے صوفی وہ ہے جو اپنے نفس کو لوریاں دے کر سلا دے۔ صوفی نفس کے خلاف ہو کر اُسے ہمیشہ کے لئے نہیں جگاتا بلکہ اُسے سُلا دیتا ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بُرائی سے لڑتے لڑتے اپنی توانائیاں زائل کرنے کی بجائے اپنے اندر اچھائی پیدا کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنے ذہنوں کو دوستانہ خیالات و افکار پر مرکوز رکھنا ہے۔ تا کہ ہماری زندگیوں میں اچھائی جنم لے سکے۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ذہن تخلیقی رجحانات رکھتا ہے۔ اِس کا رخ جس جانب ہوگا۔۔ وہی چیز بڑھنے لگے گی۔ اگر ہم اپنی توجہ اچھے اور مثبت

خیالات پر مرکوز رکھیں گے تو اچھائی بڑھے گی۔ اور اگر ہم منفی خیالات اپنے ذہن میں پالنے لگیں گے تو بُرائی بڑھے گی۔

حضرت عنایت خانؒ انسانی ذہن کو ایسا باغ سمجھتے ہیں جسے خودرو جڑی بوٹیوں سے بچانا لازم ہے۔ برائی کے رجحانات سے مسابقت بالکل ایسے ہے جیسے ان جڑی بوٹیوں کو اوپر سے کاٹ دینا تاکہ وہ دوبارہ اُگ آئیں۔ اپنے اندر اچھائی پیدا کرنے کا مطلب ہے اس باغ میں خوشبودار پھول لگانا جن کی موجودگی میں ان مسموم جڑی بوٹیوں کا دم گھٹ جائے اور ان کا ہمیشہ کے لئے صفایا ہو جائے۔ کیونکہ بُرائی کا نتیجہ خود پسندی اور خود مرکزیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لئے دل کی آبیاری کرنا احسن اعمال میں سے ایک ہے۔ اس لئے ایک صوفی کا چلن خبر پرست عالمِ دین اور اکتساب پسند مفکر سے بہتر ہے۔

عقل تفریق پسند ہے۔ اس لئے عقل پرست کی نظر اُس مقام پر رُک جاتی ہے جہاں فرق نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس دل جوڑتا ہے۔ نفس منافرت اور تفرقہ بازی کو جنم دیتا ہے جبکہ دل وحدت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے محبت، دوستی، رحم دلی روحانی سفر کا ساز و سامان ہیں۔

محبت جمالیاتی تجربے کا پھل ہے۔ یہ ایک حال ہے جو مشاہدہ حقیقت سے سالک پر طاری ہو جاتا ہے۔ محبت نفس کو سُلا دیتی ہے۔ محبت من و تو کے عالم کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔

تصوف کا مطلب محض انفرادی تعمیر و ارتقاء نہیں ہے۔ کیونکہ انفرادی تعمیر اور ارتقاء معاشرتی و عالمی ارتقاء کی پہلی شرط ہے۔ افراد کی تبدیلی ہی معاشروں کی تبدیلی کا پہلا قدم ہے۔ آج کا جمہوری معاشرہ افراد کے جملہ اذہان کی عکاسی کرتا ہے۔ اور سیاسی قائدین عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ جمہوری معاشروں کے عوام سیاسی قائدین کے فیصلوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے خیالات، افکار اور احساسات اجتماعی لاشعور کا حصہ بنتے ہیں۔ ہم اِن خیالات کو شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرتے ہیں اور دوسرے اذہان ان خیالات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس طرح ایک فرد دنیا میں جنگ یا امن فیصلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم عالمی امن کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں تو ہماری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ ہم امن کی روشنی سے اپنے دلوں کو منور کر لیں۔ حضرت عنایت خانؒ گیان میں لکھتے ہیں:

> ''اے امن کے لئے جدوجہد کرنے والے۔ تو دنیا کو امن کا تحفہ اُس وقت تک نہیں دے پائیگا۔۔ جب تک تیرے دل میں امن کی شمع روشن نہیں ہو جاتی''۔

Marfat.com

2۔ عارضی اور ابدی دنیا:

حضرت عنایت خانؒ کا مشورہ قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اپنے دلوں کو سکون اور امن سے آشنا کیۓ بغیر ہم قیدِ تکثیر سے رہائی نہیں پا سکتے۔ کثرت گزیدہ انسان من وتو کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے۔ بٹ جاتا ہے۔ تقسیم ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا غیر منقسم وحدت ہے۔ ٹکڑوں میں بٹا ہوا شعور وحدت کا رس نہیں پا سکتا۔ انسانی فہم وادراک کے عیوب واسقام کی بنیادی وجہ ٹکڑوں میں بٹ جانا ہے۔ انسان کے معاشرتی درد کی وجہ بھی منافرت اور تقسیم ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ زمین پر ایک کامل نظامِ حیات کی تلاش کر رہا ہے لیکن وہ خود سکونِ قلب سے محروم ہے۔ وہ یہ نہیں جان پایا کہ دلوں کو امن سے آشنا کیۓ بغیر دنیا میں امن کا قیام ناممکن ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ اُس نے روحانی اور زمینی دنیاؤں کو بانٹ رکھا ہے۔ والٹر لپمن اور ایلڈ لیس ہکسلے نے ہمیں اسی غلطی سے خبردار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا عارضی اور ابدی دنیاؤں کی تقسیم نے انسان کو بھٹکا دیا ہے۔

والٹر لپمن دو دنیاؤں کی نشاندہی کرتا ہے: عالمِ مادیات (material world) وہ دنیا جس میں انسان پیدا ہوتا ہے، زندگی گذارتا ہے، کام کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اور عالمِ حقیقت (realm of essence): وہ دنیا جہاں انسان کی روح انتشار اور امن میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔[5]

اسی طرح ایلڈ لیس ہکسلے دو متصادم فلسفہ ہائے حیات کے درمیان کہنہ ستیزہ کاری کے راز کو جان پایا ہے۔ ایک فلسفۂ حیات وجود اور ابدیت کے انکشافِ عاجلہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اور دوسرے فلسفۂ حیات کے نزدیک صرف وہی حقیقت ہے جو عالمِ مادیات میں ''آج'' دائرۂ حواس میں مقید ہے۔[6]

سب سے اہم اس حقیقت کا ادراک ہے کہ انسان جس آزادی اور نجات کی تمنا کر رہا ہے۔ وہ اُسے صرف روحانی اور ماورائی دنیا سے رشتہ جوڑنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی آزادی اور نجات کا سرچشمہ اُس کی اپنی ذات اور ہستی ہے۔ عالمِ مادیات وسالمات عارضی اور غیر مستقل ہے۔ یہ عالم وجود اور عدم کے مابین جھول رہا ہے۔ اس عالم میں زندگی عارضی اور

Marfat.com

نامکمل ہے۔ یہ عالمِ اضداد ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہے اضافی ہے۔ عظیم یونانی حکیم ارسطو نے ہمیں خبردار کیا تھا:

"اگر ہم اس درجہ وضاحت کے خواہاں ہیں جس کے حصول کی گنجائش ہمارے معروض میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو ہمیں مایوسی ہوگی"۔[7]

اور یہی کیفیت عالمِ مادیات کی ہے۔ جسے ہم جتنا جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔۔اتنا ہی جاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا والٹر لپمن کہتے ہیں:

"بائبل جامع اور مربوط اخلاقیاتی نظام فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ یہ کتاب، خاص طور پر، ایسے اخلاقی اصول اور قضایا جات فراہم کرنے سے قاصر ہے جن کی مدد سے اہم اخلاقی سوالات کا حل تلاش کیا جا سکے"۔[8]

مسیحی سیاسی دنیا کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ والٹر کا اعتراض درست ہے۔ گذشتہ عشروں میں مسیحی سیاسی پارٹیوں کے پیش کردہ منشور اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسیحی دنیا کی اخلاقی کایا طوفان کی زد میں ہے۔ ان مذہبی سیاسی پارٹیوں کا منشور اور پالیسیاں غیر مذہبی جماعتوں سے قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ریاست کی معاشی حکمت عملیوں کا تعلق مادی دنیا سے ہے۔ اور مادی دنیا نامکمل دنیا ہونے کی وجہ سے کسی جامع نظام کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ معاشی علوم کے اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کی مادی خواہشات پیداوار کی نسبت ہمیشہ زیادہ رہی ہیں۔ اس لئے اس دنیا میں معاشی سرگرمیوں کا لب لباب یہی ہے کہ انسان لوگوں کی مادی خواہشات کو پورا کرنے کے متوازن نظام وضع کرے اور زیادہ سے زیادہ معاشی مفادات کی تسکین کا بندوبست کرے۔ لیکن یہ تکمیل اور جامعیت نہیں ہے۔ اور چونکہ قومی پیداوار میں اضافے کے لئے لوگوں کے مخصوص گروہ کو نوازنے کا ایک پورا نظام ریاست کے اندر موجود ہوتا ہے اس لئے امیر اور غریب کے درمیان معاشی خلاء ہر وقت بڑھتا رہتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال انصاف کے ارفع و اعلیٰ تصور کا کھلم کھلا مذاق اڑا رہی ہے۔ تاہم تجربات یہ ثابت کر رہے ہیں اس صورتِ حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور غریب اور امیر کے درمیان حائل آمدنی کی خلیج کو کم کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

لیکن غربت کے عفریت کا خاتمہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ریاست کی موجود ہے ہیئت باقی ہے۔ والٹر لپمن لکھتے ہیں:

"تلخ انجام واضح ہو رہا ہے اور جدید انسان کی مایوسی یقینی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم جس قدر کامل اور جامع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس قدر زمین کو جنت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس قدر انصاف کی تمنا کرتے ہیں۔ یہ دنیا جہنم بنتی چلی جاتی ہے"۔[9]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کامل انصاف دنیا میں ممکن نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں امن اور انصاف کے قیام کی جدوجہد ترک کر دینی چاہیے اور دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے۔ دنیا کو اُس کے حال پر چھوڑ کر کسی ہندوستانی آشرم یا خانقاہ میں لو لگا کر بیٹھ جانا عمومی اخلاقی اصولوں اور تصوف کی اعلیٰ روحانی تعلیمات کے منافی ہے۔ اگر ہمارے معاشروں کو باضمیر قائدین دستیاب ہو جائیں اور لوگ انصاف پسند ہو جائیں تو اس دنیا کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح شاید انسانی توانائی کے آزادانہ ارتقاء کو ممکن بنایا جا سکے۔ اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کے معاشی مسائل ہو جائیں تو وہ اپنی توجہ روحانی ترقی کی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ روحانی دنیا ہی وہ دنیا ہے جس میں ہماری بہت سی خواہشات پوری ہو سکتی ہیں اور ہمیں خوشی مل سکتی ہے۔

اسی لیے صوفی خارجی اور باطنی دنیاؤں میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کی بات کرتا ہے۔ جب انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی گہرائیوں سے توانائی اور طمانیت کا حصول ممکن بنا سکے۔

روحانی نظریۂ حیات کی پیروی ہمارے نکتۂ نظر کو وسعت عطا کرے گی۔ اور ہم مختلف مسائل اور نتائج کی قدر پیمائی کرتے وقت پیش نظری کا مظاہرہ کر پائیں گے۔ ہم انتہائی راستے اختیار نہیں کریں گے بلکہ باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کر سکیں گے۔ اس صورتِ حال میں مفادات کا ٹکراؤ کم سے کم ہوگا۔ حضرت عنایت خانؒ The Book of Peace میں اسی متوازن رویے کی بات کر رہے ہیں:

"کیا ایک صوفی نشہ آور ادویات کے استعمال کی مذمت کرنے والی تحریکوں کا ساتھ دے گا؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ کیونکہ یہ سوال بظاہر بہت سادہ مگر پیچیدہ ہے۔ اس صورتِ حال میں غیر جانبدار رہنا

Marfat.com

ناممکن ہے۔سب سے پہلے ہمیں تمام اصولوں کا غیر جانبدارانا جائزہ لینا ہوگا اور اُس کے بعد ہمیں وہ آواز اٹھانا ہوگی جو ہمیں روحانی اور اخلاقی موقف پر قائم نظر آئی گی''۔[10]

متذکرہ بالا کتاب ہوش مندی کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔اور ہوش میں رہنے کے لئے ایک صوفی کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

''جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو۔۔ہوش میں رہنا ضروری ہے۔صوفیائے کرام کی حالت اور کیفیت ہوش مندی کی دنیوی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔وہ ہر وقت اپنے محبوب و مقصود (خداوندِ کریم) سے لو لگائے رکھتا ہے۔اس لئے ایک روحانی کیف و سرور ہر وقت اُن پر طاری رہتا ہے۔لیکن بعض صورتوں میں اُسے خدا کی مخلوق کی خدمت کا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے۔اور وہ اُس لمحے خدا کی داخلی تلاش ترک کر دیتا ہے۔خدا کی مخلوق کی خدمت کے دوران وہ اپنی پوری توجہ مخلوقِ خداوندی پر ہی مرکوز رکھتا ہے''۔[11]

ظاہر ہے اس سب کے لئے نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔تاکہ ہم اپنے محدود سماجی کردار کو کچھ وقت کے لئے بھلا دیں۔کیونکہ نفس دیگر مسائل کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے جبکہ دنیا ہم آہنگی اور ہم آمیزی کا تقاضا کر رہی ہوتی ہے۔

3۔اقوامِ عالم اور قیامِ امن:

اقوامِ عالم کے مابین بہتر اور پر امن تعلقات کا قیام کس طرح ممکن ہے؟ مختلف اقوام کے مابین سیاسی کشمکش اور جدال و قتال نے انسانیت کے سینے پر انمٹ گھاؤ لگائے ہیں۔اور مستقبل میں ایٹمی ہتھیاروں نے عالمگیر ناپیدگی کے خطرات پیدا کر دیے ہیں۔اس لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اقوامِ عالم کے مابین پائیدار امن کو یقینی بنانے کے لئے کوششیں تیز تر کر دیں تاکہ انسانیت کو عالمگیر تباہی سے بچایا جا سکے۔

عالمگیر قیامِ امن اور صوفیانہ نہجِ فکر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ عظیم جرمن مفکر کانٹ نے عمر کے آخری حصے میں امن پر عظیم مقالہ ***Towards Eternal Peace*** تحریر کیا۔اس شہرۂ آفاق مقالے کا آغاز فرد اور قوم کے تقابل سے ہوتا ہے۔یہ صاحب نظر فلسفی لکھتا ہے:

Marfat.com

''ایک قوم کے مسائل فرد کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔قوم اجتماعِ افراد کا نام ہے۔ اس لئے قومی مسائل انفرادی مسائل کا حاصل جمع ہیں۔انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں: انسان روحانی حیوان ہے۔روح مقامِ خداوندی ہے۔زندگی خدا کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔اس کے علاوہ اُس کے خیالات، احساسات، جذبات کا تعلق عالمِ اسما سے ہے۔اسی طرح قوم کے بھی دو پہلو ہیں۔قوم افراد کے ایک بہت بڑے گروپ کا نام ہے۔اور دوسری سطح پر اس گروپ کے اعمال واشغال، تصورات اور جذبات ہیں اور اس قوم کے قوانین، حکومتیں انہی اجتماعی رجحانات اور رواہمات کا عکس ہیں''۔[12]

اس طرح ہم قومی ذہن کو، کارل ینگ کے الفاظ میں، اجتماعی لاشعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو ایک گروہ کے تجربات، افکار، احساسات اور خواہشات کا مجموعہ ہے۔اس لئے ہر قوم کی شناخت کا انحصار اُس کی مخصوص تہذیب وثقافت پر ہے جو اُسے دوسروں سے مختلف بناتی ہے۔اقوام کسی صورت میں بھی اپنی شناخت پر سودہ بازی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔اور یہی بات عالمی حکومت کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یہ رکاوٹ بالفاظِ واضح تر وحدتِ انسان کے خواب کی تعبیر کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔تاہم آج ہم قوم اور قومیت کے تصور میں بہتری اور ترقی کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔

''فرد سے خاندان، خاندان سے معاشرہ، معاشرے سے قبیلہ اور قبیلے سے قوم کا سفر ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا۔یہ سریع اور باسہولت سفر نہیں تھا۔انسان یادِ ماضی سے غمگین، حال کے مسائل میں گھرا ہوا آنے والے دنوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتا رہا ہے۔انسان نے موجودہ حکومتوں کے قیام تک دن رات کوشش کی ہے۔آج کی دنیا نقائص سے بھرپور سہی لیکن جب ہم ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ترقی کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔غور کرنے پر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سماجی ارتقاء

Marfat.com

کی رفتار کچھوے کی رفتار کی مانند سست سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانیت ارتقاء پذیر ہے''۔[13]

کانٹ انسان کے فرد سے قوم تک کے سفر کو اہم فطری ارتقاء سمجھتا ہے۔ اُس کے نزدیک فطرت ایک عظیم فنکار ہے جو کشمکش اور تفاوت کے باوجود انسانوں کے مابین تعمیر و تعاون کے امکانات پیدا کرتی ہے۔ وہ فطرت کے بطن البطون میں ایک ایسی حکمت و دانش سرگرمِ عمل پاتا ہے جس کی علت ایک اعلیٰ تصور ہے جس کی طرف فطرت انسان کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس اعلیٰ تصور کو ہم انسان کے معاشرتی ارتقاء کی آخری منزل کہہ سکتے ہیں۔[14]

ہم فطرت کی اس رہنمائی کو کیا کہہ سکتے ہیں؟ ایک رہنما جو ہمیں منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ اسی طرح چارلس ڈارون نے بھی، بہترین کی بقاء (survival of the fittest) کے اصول کے ساتھ ساتھ، تعاون کے فطرتی قانون کی بھی تصدیق و تائید کی ہے۔ ڈارون لکھتا ہے:

''جونہی انسان تہذیب تشکیل دیتا ہے اور مختلف قبائل معاشروں میں ضم ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی سماجی جبلت اُن کے اندر اپنی قوم کے دیگر افراد کے لئے تعاون اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ ایک قوم کے افراد ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کر لیتے ہیں۔ جب ایک معاشرہ تعاون اور ہمدردی کی اس سطح پر پہنچ جاتا ہے تو مصنوعی طریقوں کے استعمال سے اُن کی ہمدردی اور تعاون کا دائرہ محدود کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مصنوعی طریقے استعمال نہ کئے جائیں تو انسانی ہمدردی اور تعاون کا دائرہ پھیل کر تمام انسانیت کو اپنے کریم گھیرے میں لے سکتا ہے''۔[15]

کانٹ لکھتا ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان کے اندر یہ شعور پیدا ہوا کہ اُسے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کی بجائے ایسے اصول وضع کرنے چاہئیں جو انسانیت کے باہمی رشتوں کو مضبوط کریں۔ اس مقصد کے لئے نظامِ قانون متعارف کروایا گیا جو ہر شہری کو تشدد سے بچانے کا ذمہ دار تھا اور انصاف فراہم کرنے والے ادارے اُن کے مسائل کا منصفانہ حل تلاش کر کے فیصلہ سنانے لگے۔ اس طرح اناؤں کی جنگ سرد پڑ گئی اور متصادم مفادات کے درمیان امن قائم ہو گیا۔

بالکل اسی طرح اقوامِ عالم کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ اس مقصد کے لئے بین الاقوامی قوانین کے نفاذ کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے قوانین جسے پوری دنیا تسلیم کرے اور جو پوری دنیا کو ہمسایہ ریاستوں کے جبر و استبداد سے بچانے کا کام بطریقِ احسن سرانجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لئے بین الاقوامی عدالت کی بھی ضرورت ہے جو بین الاقوامی مسائل کے منصفانہ حل کو یقینی بنائے تاکہ اقوامِ عالم مل جل کر رہنے کا اور باہمی تعاون کا درس حاصل کر سکیں۔

آج کی دنیا اقوامِ متحدہ کے ذریعے بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کر رہی ہے۔ تاہم بعض صورتوں میں اقوامِ متحدہ کا کام انتہائی مشکل بنا دیا جاتا ہے۔ افہام و تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف ریاستیں قوم پرستی اور خود مرکزیت کے جنون میں دوسری، خاص طور پر کمزور، ریاستوں کے موقف کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ کسی متفقہ لائحہ عمل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ اقوامِ عالم اپنے نقطہ ہائے نظر کو انسانی وسعتوں سے ہم کنار کریں۔ تصوف کی زبان میں، یہ ضروری ہے کہ اقوام عالم اپنے قومی اور اجتماعی نفس کو زیر کریں اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

4۔ عالمگیر معاشی ہم آہنگی:

کانٹ ہمیں بتاتا ہے کہ مالی و معاشی مفادات اقوامِ عالم کے درمیان تعاون کی فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ آج کل اس نابغہ روزگار حکیم کا یہ استدلال خاصا مضبوط نظر آتا ہے۔ ماضی میں معاشی مفادات اقوام عالم کے درمیان فسادات اور کشمکش کا باعث بنے ہیں۔ ماضی میں کئی جنگوں کا محرک معاشی مفادات کا تصادم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ صدی میں مربوط عالمی معیشت کا تصور شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ عالمی تجارت میں تیزی آ رہی ہے اور ذرائع نقل و حمل سستے اور برق رفتار ہوتے جا رہے ہیں۔ قومی اقتصادی سرگرمیاں باہمی انحصار کے اصول کے تحت کام کر رہی ہیں اور مختلف اقوام کی تجارتی بقا کا انحصار دوسری اقوام پر ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی منڈیوں کا قیام قومی معیشت سے گہرے رشتے استوار کر رہا ہے۔

Marfat.com

سرمایے کی منڈیوں میں سرمایے کا بہاؤ باہمی مالی مفادات کو ہم آہنگ کر کے سُود کی شرح میں بتدریج کمی کا باعث بن رہا ہے۔ اور قومی معیشت عالمی معیشت کا حصہ بن رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستیں آزادانہ طور پر اپنی معیشت کو خود کنٹرول نہیں کر پا رہیں۔ بین الاقوامی اقتصادی و مالیاتی تعاون بہت سے میدانوں میں ناگزیر ہو چلا ہے۔ بہت سے بین الاقوامی ادارے اس سلسلے میں اہم ترین کام سرانجام دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی ادارہ اس سلسلے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اِن اداروں کو کچھ اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ ان اداروں میں تمام فیصلے خالص جمہوری انداز میں ووٹ کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان اداروں کو، محدود پیمانے پر، قومی اقتدارِ اعلیٰ تفویض کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف اس طور پر ممکن ہے کہ ادارہ، حقیقت پسندانہ حد تک، ممبر ریاستوں کے اقتصادی حجم کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنا کام سرانجام دے۔ ان اداروں کو 24 ارکان پر مشتمل انتظامی بورڈ چلا رہا ہے جنہیں 177 ممبر ممالک سے منتخب کیا جاتا ہے۔ دراصل ایگزیکٹو بورڈ کو ووٹ کا حق حاصل نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہمیشہ اتفاقِ رائے ہوتا ہے۔ اس طرح تمام ایگزیکٹو ڈائریکٹرز ہر مشورے پر غور کرتے ہوئے بہتر سے بہتر فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح قومی نقطہ ہائے نظر کے نفس کو قابو میں رکھتے ہوئے ممبران کے وسیع تر مفاد میں فیصلے کیے جاتے ہیں اور موزوں توازن برقرار رکھا جاتا ہے۔

ان اداروں نے، اکثر اوقات، عالمی معیشت کے لئے قابلِ قدر اقدامات اٹھائے ہیں۔ اگرچہ بہت سے فیصلوں پر دوطرفہ گفت وشنید کی ضرورت ابھی موجود ہے۔ تاہم جی فائیو یا جی سیون، پانچ یا سات صنعتی ترقی یافتہ اقوام، کے درمیان ہونے والی بات چیت بین الاقوامی معاشی تعاون کی جانب اٹھنے والا مثبت قدم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس سے نہ صرف اقوامِ عالم کے مابین تعاون اور شراکت کی نئی راہیں کھلی ہیں بلکہ اس ضمن میں بنائی جانے والی حکمتِ عملیوں کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔ اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ معاشی و اقتصادی میدانوں میں بڑھتا ہوا تعاون ایک دن عالمی اقتصادی کونسل کی جمہوری پیمانوں پر توسیع اور ارتقاء کا باعث بنے گا۔[16]

Marfat.com

یہ صورتِ حال خوش آئند ہے لیکن ہم اسے ارتقاء کی جانب اٹھنے والا محض پہلا قدم کہہ سکتے ہیں۔ ان میدانوں میں جہاں تعاون کی فوری ضرورت ہے وہاں صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک قومی مفادات کے تنگ دائروں سے باہر نکل کر دیکھنے اور سوچنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ صورتِ حال انتہائی مایوس کن ہے۔ اقوامِ عالم کے مساوی اور یکساں مفاد کا روحانی اور اخلاقی نعرہ اُن کے لئے سمع خراشی کا باعث بنتا ہے لیکن ضمیر خراشی کا نہیں۔ اس کے علاوہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے درمیان اقتصادی جنگ کے مناظر بسا اوقات تعاون کے عمل کو سست رو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس لئے تعاون اور افہام و تفہیم کا دائرہ وسیع کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ حضرت عنایت خان The Book of Peace میں کئی ایسے اقدامات تجویز کرتے ہیں جو حالات کو بہتری کی جانب لے جاسکتے ہیں۔

5۔ مجوزہ اقدامات:

بعض تصوریت پسند لوگوں نے بین الاقوامی زبان کی تشکیل و ایجاد کی سعی کی ہے تاکہ نسلِ انسانی کو ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکے۔ تاہم اُن کی یہ کوشش ناکام رہی ہے۔ لیکن انسان کے دل کی زبان ایک ہے۔ ہمارا دل ایک ہی زبان بولتا ہے جسے ہم لسان القلب کہہ سکتے ہیں۔ حضرت عنایت خانؒ متذکرہ بالا کتاب (کتابِ امن) میں بابل کا ایک قصہ سناتے ہیں جہاں مختلف زبانیں بولی جانے لگیں۔ لفظ بابل (Babel) کا مطلب ہے "خدا کا دروازہ"۔ لیکن خدا کی دہلیز پر صرف ایک ہی زبان بولی جاتی ہے اور وہ ہے دل کی زبان۔ حقیقی بابل دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے۔ یہ دل کی دنیا کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کی زبان کوئی زمینی زبان نہیں ہے۔ اس شہر کی زبان موسیقی ہے جسے لسانِ عالم کہا جاتا ہے۔[17]

عبرانی زبان کے لفظ ***bab-ilu*** کا مطلب دریار ہے۔ لیکن ***balal*** کا مطلب منتشر کرنا ہے مگر ان دونوں الفاظ کا تلفظ ایک ہے۔ اس لئے کتابِ تخلیق (Genesis) کی ایک آیت (9:1-1) میں لسانیاتی حجت و نزاع کی وضاحت ہوتی ہے جس کی وجہ ان الفاظ کی ہم صوتیت تھی۔[18]

Marfat.com

موسیقی عالمگیر زبان ہے۔ ہر تہذیب، ہر ثقافت، ہر معاشرہ اسے سن رہا ہے۔ اس لئے یہ زبانِ دل ہے۔ یہ ایک شیرازہ ہے جس سے انسان کو وحدت اور اخوت کی ایک لڑی میں باندھا جا سکتا ہے۔ موسیقی جمالیاتی استغراق کی سب سے غیر مرئی اور تجریدی ''شکل'' ہے۔ یہ مراقباتی استغراق کے قریب تر ہے۔ کوئی بھی انسانی تخلیق یا فن اس سے زیادہ روحانی فیوض کا باعث نہیں ہو سکتا۔

مشترکہ تصورات بھی مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے جنگلات کا تحفظ کرنے والے اور ویل مچھلیوں کی بقاء کے لئے سرگرم غیر سرکاری تنظیموں کے کارکنوں میں وحدت اور اتفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا ماحول خطرے میں ہے۔ اور یہ نوعِ انسانی کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ ماحول کو درپیش خطرات سے انسان اس نتیجے پر پہنچ رہا ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔

> ''ہر انسان کے اندر امن کی شدید ترین خواہش موجود ہے۔ ہر شخص اپنی ہستی کی گونج سن سکتا ہے جو ایک ہونا چاہتی ہے۔ یہ آواز اس وقت سنائی دیتی ہے جب انسان کسی ایک مقصد کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں''۔[19]

دنیا بھر میں ایٹمی جنگوں کے خلاف شعور اجاگر ہو رہا ہے اور لوگ امن کے لئے آواز بلند کر رہے ہیں۔ بہت سی امن پسند تحریکیں دنیا بھر میں کام کر رہی ہیں۔ خاص طور پر تحریکِ امن (Peace Movement) جو جوہری جنگوں کے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرتی ہے اور جوہری ہتھیاروں کے خاتمے کے لئے مصروفِ عمل ہے۔ تاہم عالمگیر اخوت کے جنون میں ہمیں اُن لوگوں کے ساتھ بُرا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے جن کی فکری دنیا آج تک تنگ ہے۔

کیا سائنس، جو مذہب کے برعکس عالمگیر نوعیت کی حامل معلوم ہوتی ہے، لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا یہ امن کے راستوں کو روشن کر سکتی ہے؟

حضرت عنایت خان کتابِ امن میں سائنس کی حدود کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''حتیٰ کہ ایک سائنس دان بھی جانتا ہے کہ سائنس ایک عالمگیر آئیڈیل نہیں ہو سکتی۔ سائنس جنگ کی لونڈی رہی ہے۔ اسے ابھی اپنے بنیادی

Marfat.com

اصول طے کرنے ہیں۔ اسے کوشش کرنی ہے کہ یہ انسان کے دلوں میں گھر سکے''۔[20]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''کچھ عرصہ بعد سائنس دان شعور کی کھوج لگانا شروع کر دیں گے۔ وہ شعور اور ذہن کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنے لگیں گے۔ اس کے بعد وہ پیغمبروں اور صوفیائے کرام کی یہ بات ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حقیقی دنیا ہمارے حواس کے محدود دائروں سے باہر موجود ہے''۔[21]

موجودہ دور کی سائنس اسی طرف بڑھ رہی ہے۔ آج مغرب میں بہت سی روحانی تحاریک کی بنیاد دور مابعد از جدید کے سائنسی نظریات پر ہے۔ مثال کے طور پر اس دور کے سائنسی نظریات نے New Age Movement کے روحانی نظریات کو متاثر کیا ہے۔ اس لئے یہ تحریک اپنے فلسفیانہ قضایا جات کو فلسفۂ کامل کہتی ہے۔

تاہم، حضرت عنایت خانؒ کے خیال میں، انسانیت کو مذہب اور روحانیت کی مدد سے ہی اخوت کے مضبوط رشتوں میں باندھا جا سکتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ وہ محبت اور جذباتی لگاؤ پیدا نہیں کر سکتے جو مذہب کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔

6۔ عالمگیر مذہبی اقدار کے احیاء کی ضرورت:

حضرت عنایت خانؒ مذہب کی اہمیت کو کچھ یوں واضح کرتے ہیں:

''عالمگیر اخوت کا تصور کسی بزرگ و برتر ہستی کے تصور کے بغیر ادھورا ہے۔ خدا ہی وہ رشتہ ہے جو پوری انسانیت کو مربوط کرتا ہے۔ خدا کے تصور کے بغیر عالمگیر اخوت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُس بلند و بالا ہستی کا تصور ہی عالمگیر اخوت کے تصور کے لئے روح کا کام کرتا ہے۔ خدا کے تصور کے بغیر یہ تصور ایک ایسے جسم کی مانند ہے جو بے روح ہے۔۔ مردہ ہے۔ اگر لوگوں کے دل پگھل کر دریا کی صورت میں بہنا بھی

Marfat.com

شروع کر دیتے ہیں تو یہ دریا کس سمندر میں گریں گے۔ بلاشبہ انسانی احساس، مروت، ہمدردی اور محبت کے دریاؤں کے رخ کا تعین ذاتِ حق کا تصور ہی کرتا ہے۔ کیونکہ خدا ہستی کا بے کراں سمندر ہے''۔[22]

اس لئے آج دنیا کو عالمگیر مذہبی شعور کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے مذہبی نفس کو زیر کرنا لازم ہے۔ ہمیں یہ بھلانا ہوگا کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مخصوص رسوم کی پابندی لازم ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور راستہ خدا تک نہیں جاتا۔ مذاہب کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہے۔ اگر تصادم پیدا ہوتا ہے تو رسم پرستوں کے اذعانی اصولوں کی وجہ سے۔ مذاہب میں تصادم اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مذاہب کی عالمگیر تعلیمات کو جانے بغیر ظاہری رسوم اور عبادات کے طریقۂ کار کو ہی مذہب سمجھ لیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ اور رسوم ذرائع ہیں مقاصد نہیں۔ راستے ہیں منزل نہیں۔ عظیم مذاہب کا بتایا گیا ہر راستہ ایک ہی منزل کی طرف جاتا ہے۔ جیسے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لئے کئی راستے موجود ہوتے ہیں لیکن چوٹی ایک ہوتی ہے۔ اسی طرح تمام راستوں، تمام دھاراؤں کا رخ ایک ہی سمندر کی طرف ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مذاہب کے مابین تعاون کے راستے تلاش کئے جائیں۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں اور مذہبی رسومات کی تعظیم اور احترام عالمگیر امن کے صدیوں سے بند دروازے ہمیشہ کے لئے کھول سکتا ہے۔[23]

اس مقصد کے لئے حضرت عنایت خانؒ نے عالمگیر عبادت کا تصور دیا ہے جو صوفی تحریک کی اہم ترین سرگرمیوں میں سے ایک ہے۔ اس عبادت کے دوران دنیا کے تمام عظیم ترین مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ عالمگیر عبادت کی رسومات اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں کہ نورِ ازلی کس طرح انسانیت پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس دوران دنیا کے عظیم مذاہب کی مقدس کتب سے آیات کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ دل میں خداوندِ کریم کی محبت کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ انسانوں کے درمیان تحمل اور برداشت کے رشتوں کا سراغ لگایا جائے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ بھی دنیا کو پرامن بنانے کا ایک قدم ہے۔

Marfat.com

7۔ دُعائے امن:

- اے ہمیشہ رہنے والے رب۔۔ ہمیں اپنا امن وسکون عطا فرمائے تا کہ ہماری روح اس سے چمک اٹھے!
- ہمیں اپنا امن نصیب فرمائے۔۔ تا کہ ہمارے فکر و اعمال اور گفتگو ہم آہنگی کا مجازی روپ دھار لیں۔
- اے خدا ہمیں امن نصیب فرمایئے۔۔ تا کہ ہم آپ کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں اور قناعت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔
- اے خدا زمین پر امن نازل فرمایئے۔۔ تا کہ ہم دنیوی شور وغل میں آپ کو یاد رکھ پائیں اور آپ کی دی ہوئی خوشیوں سے لطف اندوز ہو سکیں!
- اے خدا ہمیں امن نصیب فرمایئے۔۔ تا کہ ہمارے اندر ضبط وتحمل پیدا ہو سکے۔ ہم آپ کی مخلوق سے پیار کر سکیں اور آپ کی مغفرت کے حقدار ٹھہریں!
- اے خدا ہمیں امن وسکون دے۔۔ تا کہ ہماری زندگیاں آپ کی مشیت کا روپ دھار لیں اور آپ کا نور ہماری جہالت دور کر دے۔
- اے خدا ہمیں امن وسکون کی دولت عطا فرمایئے۔۔ تا کہ ہم سب ایک کنبے کی صورت میں رہ سکیں اور عالمگیر اخوت کے رشتے میں بندھ جائیں!

Marfat.com

ماحصل

گزشتہ ابواب میں عالمگیر تصوف کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت عنایت خانؒ کے صوفیانہ پیغام سے، خاص طور پر، مغربی قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے کتاب ہذا کے پیش لفظ میں لکھا ہے، یہ کتاب تصوف کا مکمل تعارف نہیں ہے۔تصوف انسانی فکر وعمل کا آخری کنارہ ہے۔لہٰذا اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

تصوف کا مغز روحانیت ہے۔ یہ خدا سے ملنے، دریافت کرنے یا اپنی ذات میں اُس کی وہ صفات پیدا کرنے کی شدید ترین آرزو ہے جنہیں انسان جان سکتا ہے۔ یہ روحِ انسانی کا اپنی اصل سے واصل ہونے کا شوق ہے۔تصوف کے سلاسل اُن باطنی راہوں کو روشن کرتے ہیں جن پر چل کر ہم اپنی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ مغرب میں حضرت عنایت خانؒ نے تصوف کا انمول تحفہ دیا ہے۔ یہاں مریدین کو اعتماد کے ساتھ روحانی رازوں کا امین بنایا جاتا ہے جو اُن کی شخصی بالیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عنایت خانؒ نے مراقبات اور مجاہدات کا اہتمام کیا ہے تاکہ مغرب کے مادہ زدہ لوگ الوہی شعور تک رسائی حاصل کر سکیں۔اس لئے اُن کی باطنی تعلیمات کو ابھی تک شائع نہیں کیا گیا۔ کیونکہ روحانی تعلیمات اور مجاہدات تصوف کا اہم مگر لطیف ترین حصہ ہیں۔

صوفی تحریک کی اہم ترین سرگرمی مکتبِ باطنیہ (inner school) ہے۔اس کا آغاز 1923 میں جینوا میں ہوا تھا اور اس کا بنیادی مقصد صوفیائے کرام کی تعلیمات کو محفوظ اور عام کرنا تھا۔ اگرچہ حضرت عنایت خانؒ، ایک صوفی ہونے کے ناطے، تنظیمی وانتظامی معاملات کو پسند نہیں فرماتے تھے۔لیکن انہیں محسوس ہو چلا تھا کہ مغرب میں صوفی پیغام کے فروغ کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے۔ تاہم اس تحریک کی روح صوفیانہ پیغام ہی ہے لیکن جس طرح دنیا میں رہنے کے لئے روح کو عنصری جسم کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح صوفی تنظیم بھی صوفیانہ پیغام کا جسم ہے۔اس تنظیم کو مادی مفادات سے بچانے کے لئے اسے پیشہ ور پروہتایت اور پاپائیت سے پاک رکھا گیا ہے۔صوفی تنظیم صوفیانہ پیغام کی نشرواشاعت کا ذریعہ ہے فی ذاتہ مقصد نہیں ہے۔ اس تنظیم سے وابستہ لوگ رضا کارانہ طور پر کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی دنیوی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر صوفی تنظیم سے وابستہ لوگ باطنی اور خارجی کاموں میں توازن اور ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔

تنظیم کا ڈھانچہ درجاتی نوعیت کا ہے جس کی وضاحت کا سہرا بھی حضرت عنایت خانؒ

Marfat.com

کے سر ہے۔ یہ درجاتی ڈھانچہ اُن روحانی رشتوں اور رویوں کی عکاسی کرتا ہے جو مرکزی سرگرمیوں میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تنظیمی ڈھانچہ تنظیم کے قائد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ تنظیمی امور کو سمجھے اور اس کی سمت متعین کرے۔ اس کے علاوہ مختلف مشاورتی کونسلز میں اہم امور زیرِ بحث آتے ہیں جن سے فیصلہ سازی میں مدد ملتی ہے۔

تصوف کی کلاسیکی روایت مرشد، مرید اور روحانی تربیت تک محدود تھی۔ اسی لئے تصوف کے مختلف سلاسل وجود میں آئے اور ہر روحانی معلم کے گرد اُس کے چاہنے والے جمع ہونے لگے۔ پیر اور مرید کے درمیان رشتہ ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس لئے مرشد کی تلاش میں ایک مرید کو آزاد ہونا چاہیے۔

جدید صوفی تحریک کی بنیاد حضرت عنایت خانؒ نے رکھی ہے۔ بین الاقوامی صوفی تحریک دبستانِ باطنیہ کے ساتھ ساتھ ایک تنظیم بھی ہے جس کا مقصد صوفیانہ پیغام کی روشنی کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے لئے صوفیانہ پیغام کی نشر واشاعت میں مصروف ہر شخص پر وحدت اور ہم آہنگی کے اصول کی پیروی لازم ہے۔ موجودہ دور میں پیر ومرشد ہدایت خان کی رہنمائی بین الاقوامی صوفی تحریک کام کر رہی ہے۔ بین الاقوامی صوفی سلسلے کی بنیاد پیر ومرشد ولایت عنایت خانؒ نے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی صوفی اسلامیہ سوسائٹی بھی بین الاقوامی صوفی تحریک کے ساتھ مل کر اسلامی تصوف کی روشنی دنیا بھر میں پہنچا رہی ہے۔

ہر تحریک اور تنظیم انسانی کاوش ہے اور اس لئے، کچھ حد تک، نامکمل رہتی ہے۔ لیکن بین الاقوامی صوفی تحریک کے پیچھے حضرت عنایت خانؒ جیسی فیضان خیز شخصیت ہے۔ اور حضرت عنایت خانؒ ہمیشہ مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ ''وہ ان کی شخصیت کو دیکھ کر نابینا نہ ہو جائیں۔۔ بلکہ اُس پیغام کو سمجھیں جو اُن کے توسط سے پہنچایا جا رہا ہے''۔ حضرت عنایت خانؒ کی تعلیمات اور اور صوفی تحریک کی سرگرمیوں کے علاوہ ایک تشویق۔۔ ایک فیض۔۔ ایک فیضان انسانی قلب وضمیر پر اتر رہا ہے۔ یہ سب صوفیانہ پیغام کی برکت ہے جو دنیا کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے۔ اس کے پیچھے خدائی حقیقت ہے۔ ہم سب واسطہ ضرور ہیں لیکن سب کچھ ہماری وجہ سے نہیں ہو رہا۔ حضرت عنایت خانؒ کہا کرتے تھے:

> ''پیغامبر وہ پردہ ہے جو پیغام کو چھپا سکتا ہے۔ اور پیغام خدا کو آپ کی نظروں سے اوجھل کر سکتا ہے''۔

(ہمیں پیغامبر کے ذریعے پیغام تک پہنچنا ہے اور پیغام کے ذریعے خدا تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ پیامبر اور پیغام سے آگے بڑھنا ہے!)

Marfat.com

حوالہ جات

Chapter 1

1 Quoted by A J Arberry, *An Introduction To the History of Sufism*, Longman, Green, London, 1942, p 44.
2 For further data on this see L Hoyack in *De Soefi Gedachte*, June 1954.
3 In A J Arberry, *Sufism: An Account of the Mystics of Islam*, London, 1950, pp 52–3.
4 L Hoyack, 'De Wijsheid van Hermes Trismegistos', in *De Soefi Gedachte*, September 1954, p 66 (quoted from H Brugsch, *Religion und Mythologie der alten Egypter*).
5 *The Sufi Message of Inayat Khan*, II, p 202.
6 Hoyack, 'De Wijsheid', p 68.
7 *The Sufi Message*, X, p 203.
8 ibid, *IX*, p 173.
9 ibid, p 173.
10 ibid, p 174.
11 Quoted in *Emergence, Journal for Evolving Consciousness*, 1, p 8.
12 ibid, p 8.
13 See the penetrating analysis by R C Zaehner in his *Hindu and Muslim Mysticism*.
14 Arberry, *Sufism*, p 36.
15 ibid, p 37.
16 R A Nicholson, *The Mathnavi of Jelal-ud-Din Rumi*, E. J. W. Gibb Memorial Series, Lucas, London, 1972, p 5.
17 *The Sufi Message*, X, p 141.

18 *Complete Works of Pir-o-Murshid Hazrat Inayat Khan, original texts: Lectures on Sufism 1923, 1, January–June,* East–West Publications, London/The Hague, 1989, p 145.
19 *Mystical Poems of Rumi,* translated by A J Arberry, University of Chicago Press London, 1968, p 11.
20 ibid, pp 18–19.
21 ibid, pp 9–10.
22 ibid, p 30.
23 *Poems from the Divan of Hafiz,* Javidan Publication, 1963, p 25.
24 ibid, p 65.
25 ibid, p 34.
26 *The Bustan of Saadi,* The Wisdom of the East Series, John Murray London, 1911, p 23.
27 *The Sufi Message,* XI, p 115.
28 *The Gulistan or Rose Garden of Saadi,* translated by Edward Rehatsek, George Allen & Unwin, London, 1964, p 105.
29 ibid, pp 88–9.
30 See Arberry, *An Introduction to Sufism,* pp vi–x.
31 This Order was founded by two earlier members of the Suhrawardia family, not the great Shihabuddin Yahya al Suhrawardi mentioned on p 5.
32 W D Begg, *The Holy Biography of Hazrat Khwaja Muin-ud-Din Chishti,* W D Begg, Ajmer, 1960, p 51.
33 ibid, p 107.
34 ibid, p 113.
35 See Zahurul Hassan Sharib, *Khwaja Gharib Nawaz,* p 97.

Chapter 2

1 The material for this chapter is taken from Part I of the *Biography of Pir-o-Murshid Inayat Khan,* East–West Publications, London/The Hague, 1979. References in the text are shown as (*B*, p...).
2 Some interesting material on Maula Bakhsh's motivations and aims in his search for musical reform and development can be found in E de Jong-Keesing, *Inayat Khan: A Biography,* East–West Publications, London/The Hague, 1974.
3 There are colourful additional descriptions of the life and mood

Marfat.com

in Baroda at the time in *Murshid* Musharaff Khan's memoir, *Pages in the Life of a Sufi*, Sufi Publishing Company, 1971.

4 *Murshid* is the Indian word for spiritual guide. *Pir-o-Murshid* (Eldest Teacher and Guide) is the leader of the spiritual school. The disciples are called *mureeds*.

5 The *vina* is an Indian musical instrument similar to a guitar, but has two large gourds, one at each end.

Chapter 3

1 The material for the first part of this chapter is taken from Part II of the *Biography of Pir-o-Murshid Inayat Khan*, East–West Publications, London/The Hague, 1979. Page references are given as in the previous chapter.

2 E. de Jong-Keesing, *Inayat Khan: a Biography*, East–West Publications, The Hague/London, 1974, p 122.

3 This is dealt with at greater length in chapter 11.

4 *The Flower Garden of Inayat Khan*, East–West Publications, The Hague/London, 1978, p 10.

5 From the 1982 commemorative issue of the Dutch magazine *De Soefi Gedachte*, pp 51–3.

6 S van Stolk and D Dunlop, *Memories of a Sufi Sage: Hazrat Inayat Khan*, East–West Publications, London/The Hague, 1967, pp 62–3.

7 ibid, p 6.

8 *Forty Years of Sufism (Sufi Quarterly Special Issue)*, 1950, p 47.

9 Commemorative issue, *De Soefi Gedachte*, pp 45–8.

10 A place near Paris where Hazrat Inayat Khan then lived and gave his first summer school in 1921.

11 Aquarelle: a painting in watercolour, sometimes with pencil or ink.

12 Commemorative issue, *De Soefi Gedachte*, pp 30–31.

Chapter 4

1 *The Sufi Message of Inayat Khan*, X, pp 130–31.

2 A J Arberry, *Sufism: An Account of the Mystics of Islam*, George, Allen & Unwin, London, 1950, pp 134–5.

3 *The Sufi Message* VIII, pp 20–21.

Marfat.com

Chapter 5

1 F Capra, *The Turning Point*, Wildwood House, London, 1982, p 76.
2 *The Sufi Message* XI, p 25.
3 *The Kybalion*, Yogi Publication Society, Chicago, 1908, p 137.
4 Guy Murchie, *Music of the Spheres*, II, Dover, New York, 1967.
5 *The Sufi Message* II, pp 18–19.
6 Capra, *Turning Point*, p 69.
7 Miahia Kaku and Jennifer Trainer, *The Cosmic Quest for the Theory of the Universe.*
8 *The Sufi Message* II, p 18.
9 *The Sufi Message*, XI, p 22.
10 ibid, p 9.
11 ibid, p 57.
12 ibid.
13 ibid, pp. 60–61.
14 *The Sufi Message*, II, p 18.
15 F Capra, *The Tao of Physics*, Shambala, Boulder, 1975, p 223.
16 *The Sufi Message* XI, p 69.
17 Capra, *Turning Point*, p 83.
18 ibid, p 70.
19 ibid.
20 *The Sufi Message* XI, pp. 50–51.
21 G Murchie, *Music of the Spheres*, II, Dover, New York, 1967, p 262.
22 *Art meets Science and Spirituality in a Changing Economy*, The Hague, 1990, p. 61.
23 Inayat Khan, *The Soul, Whence and Whither*, East–West Publications, London/The Hague, 1984, p 41. Elsewhere, Inayat Khan defines 'soul' as that extent of radiance or intelligence that is found particularly in the human being.
24 ibid, p 9.
25 *The Sufi Message* V, p 26.
26 Inayat Khan, *The Soul*, p 9.
27 ibid, p 15.
28 ibid, p 26.
29 ibid, pp 9–10.
30 ibid, p 15.
31 Murchie, *Music of the Spheres*, I, pp 218–19.

Marfat.com

1 Hazrat Inayat Khan, *The Soul, Whence and Whither*, East–West Publications, London/The Hague, 1984.
2 ibid, p 52 with some minor corrections based on the original texts of the lectures as published in *Complete Works of Pir-o-Murshid Hazrat Inayat Khan (original texts): Lectures on Sufism, 1923, II*, East–West Publications, London/The Hague, 1989.
3 Inayat Khan, *The Soul*, pp 23–4.
4 ibid, p 20.
5 ibid, p 21, with some corrections based on the original texts in the *Complete Works*.
6 ibid, p 29.
7 ibid, p 38.
8 ibid, p 173.
9 ibid, p 47.
10 ibid, p 48.
11 ibid, p 55.
12 ibid, p 71.
13 ibid, p 71.
14 ibid, p 74.
15 ibid, p 74.
16 L Hoyack, *De Boodschap van Inayat Khan*, Uitgeverij Ae. E Kluwer, Deventer, p 63.
17 Inayat Khan, *The Soul*, p 76.
18 ibid, p 81.
19 ibid, p 44.
20 ibid, p 104.
21 ibid, p 104.
22 ibid, p 104.
23 ibid, pp 107–108.
24 ibid, p 112.
25 *The Sufi Message of Inayat Khan*, IV, *The Mind World*.
26 *The Sufi Message of Inayat Khan*, I. *The Purpose of Life*, p 189.
27 ibid, p 26.
28 ibid, p 26.
29 Matthew 7:7 (Authorised Version).
30 *The Sufi Message of Inayat Khan*, II, *Cosmic Language*, p 248.
31 Inayat Khan, *The Soul*, p 130.

32 ibid, p 135.
33 See R A Moody, *Life after Life*, Bantam Books, New York, 1975, and also his *Reflections on Life after Life*, Bantam Books, New York, 1977.
34 Moody, *Life after Life*, p 24.
35 Inayat Khan, *The Soul*, p 141.
36 ibid, p 160.
37 ibid, p 160.
38 ibid, p 153.
39 ibid, p 145.
40 ibid, p 145.
41 ibid, p 147.
42 Moody, *Life after Life*, p 46.
43 ibid, pp 46–7.
44 Inayat Khan, *The Soul*, p 37.
45 R A Moody, *Reflections on Life after Life*, p 32.
46 Inayat Khan, *The Soul*, p 150.
47 ibid, p 160; also p 140: 'The time of the next world is quite different from the time here.' Also Moody, *Reflections*, p 101.
48 Inayat Khan, *The Soul*, p 15.
49 ibid, p 156.
50 ibid, p 159.
51 ibid, p 159.
52 ibid, p 150.
53 ibid, p 150.
54 ibid, p 164.
55 ibid, p 171.
56 ibid, p 169.
57 ibid, p 174.
58 ibid, p 178.
59 ibid, p 174.

Chapter 7

1 Inayat Khan, *The Complete Sayings*, Omega Publications, New Lebanon, 1978, p 49.
2 *The Bhagavadgita*, New American Library, 1944, chapter XI, pp 92–3.

3 ibid, p 92.
4 The *Qur'an, sura* CXII.
5 P Carus, *The Gospel of Buddha*, Open Court Publishing Company, London, 1921, pp 5, 6.
6 Deuteronomy, 10: 12, 13 and 17–20 (Authorised Version)
7 *Bhagavadgita*, pp 95–6.
8 *The Sufi Message of Inayat Khan*, I, p 70.
9 ibid, p 70.
10 *The Sufi Message*, IX, p 89.
11 ibid, p 92.
12 ibid, p 89.
13 This happens when the human being is born: some spirit is absorbed by the material form which is our body.
14 *The Sufi Message*, XI, p 64.
15 *The Sufi Message*, XI, pp 24–5.

Chapter 8

1 *The Sufi Message of Inayat Khan*, XI, p 163.
2 *The Sufi Message, Gayan Vadan Nirtan*, p 86.
3 *The Sufi Message*, V. p 245.
4 ibid, p 250.
5 The mystical meaning of sound is an important subject to which we will return in chapter 10.
6 *The Sufi Message*, XIII, p 135.
7 ibid, p 140.
8 ibid, p 142.
9 *The Sufi Message*, IV, p 155.
10 ibid, p 172.
11 ibid, p 155.
12 ibid, p 156.
13 ibid, pp 108–109.
14 ibid, p 109.
15 ibid, p 117.

Marfat.com

Chapter 9

1 *The Sufi Message of Inayat Khan*, IV, p 126.
2 *The Sufi message*, VIII, p 99.
3 ibid, p 99.
4 *The Sufi Message*, XIII, p 204.
5 *The Sufi Message*, VIII, p 104.
6 *The Sufi Message*, III, p 255.
7 ibid, p 239.
8 ibid, p 239.
9 ibid, p 233.
10 ibid, p 234.
11 ibid, p 240.
12 ibid, p 235.
13 ibid, p 236.
14 ibid, p 255.
15 Compare with Chapter 6, above, where this matter is also dealt with.
16 *The Sufi Message*, VIII, p 104.
17 *The Sufi Message*, V, p 240.
18 *The Sufi Message*, XIII, p 175.
19 ibid, p 189.
20 Inayat Khan, *The Complete Sayings*, p 8.
21 *The Sufi Message*, XIII, p 191.
22 See Rumi's poem quoted on pp 10–12.
23 Yasna 33.14 in *The Divine Songs of Zarathustra*, edited by I J S Tareporewala, Bombay, 1951, p 348 (free English rendering).
24 *The Sufi Message*, III, p 255.

Chapter 10

1 See chapter 5 above, esp. pp 55–62.
2 *The Sufi Message of Inayat Khan*, II, pp 37–8.
3 ibid, p 14.
4 John 1:1.
5 *The Sufi Message*, VIII, pp 62–7.
6 J E Berendt, *Nada Brahma*, East–West Publications, London/The Hague, 1988, esp. chapter IX.

7 *The Sufi Message*, II, p 124.
8 ibid, p 124.
9 ibid, p 130.
10 ibid, p 148.
11 See chapter 5, above, p 55.
12 Berendt, *Nada Brahma*, pp 46, 47.
13 G Murchie, *Music of the Spheres*, II, Dover, New York, 1967, p 338.
14 ibid, p 261.
15 ibid, p 342.
16 Murchie, *Music of the Spheres*, I, p 85. This progression, discovered by the German astronomer Johann Elert Bode, was developed into the so-called Bode's Law.
17 Berendt, *Nada Brahma*, p 104.
18 *The Sufi Message*, II, p 149.
19 ibid, p 149.
20 *The Sufi Message*, IV, p 217.
21 *The Sufi Message*, II, p 118.
22 ibid, p 119.
23 ibid, p 148.
24 See chapter 8, Mysticism: Unity with God.
25 *The Sufi Message*, II, p 151.
26 ibid, p 149.
27 ibid, n 25.
28 ibid, p 152.
29 See chapter 2, above, p 32.

Chapter 11

1 *The Sufi Message of Inayat Khan*, IV, p 15.
2 ibid, p 18.
3 ibid, p 19.
4 ibid, p 15.
5 ibid, p 20.
6 ibid, p 36.
7 ibid, p 21.
8 *The Sufi Message*, V, p 235.

Marfat.com

9 *The Sufi Message*, IV, p 49.
10 See Deepak Chopra, *Quantum Healing, Exploring the Frontiers of Mind/Body Medicine*, New York, 1989.
11 *The Sufi Message*, IV, p 54.
12 ibid, p 55.
13 ibid, p 39.
14 See Chopra, *Quantum Healing*, p 76.
15 *The Sufi Message*, IV, p 43.
16 ibid, p 33.
17 ibid, p 24.
18 ibid, pp 25, 26.
19 See Chopra, *Quantum Healing*, p 259.
20 *The Sufi Message*, IV, p 33.
21 ibid, p 88.
22 See Chopra, *Quantum Healing*, p 73.
23 *The Sufi Message*, IV, p 32.
24 ibid, p 46.
25 ibid, pp 33, 34.
26 From the unpublished series of 'Sangatha I', p 1.
27 ibid, p 34.
28 *The Sufi Message*, pp 107, 108.
29 See Chopra, *Quantum Healing*, p 237.
30 *The Sufi Message*, IV, p 89.
31 ibid, p 76.
32 ibid, pp 80–87.
33 ibid, p 87.
34 ibid, p 85.
35 ibid, p 87.

Chapter 12

1 *The Complete Sayings of Hazrat Inayat Khan*, p 65.
2 ibid, p 202.
3 These teachings originated in America in an earlier period of Inayat Khan's teaching. They were written down by Samuel Lewis. But the deep inspiration in many passages carries the unmistakable sound of Inayat Khan's unique voice.

Marfat.com

4 See chapter 9, p 90.
5 Walter Lippmann, *The Public Philosophy*, Chatto & Windus, London, 1955, pp 127–8.
6 Aldous Huxley, *The Perennial Philosophy*, Chatto & Windus, London, 1947, p 220.
7 Quoted by Lippman in *Public Philosophy*, p 130.
8 ibid, p 132.
9 ibid, p 127.
10 'The Book of Peace', chapter 1, p 2.
11 ibid, chapter 3, p 6.
12 'The Book of Peace', chapter 2, p 3.
13 ibid, p 4.
14 Immanuel Kant, *Toward eternal peace*, Wereld Bibliotheek, Amsterdam, 1915, in the beginning of the first appendix are 'the guarantees for eternal peace'.
15 Quoted by G. Murchie in *The Seven Mysteries of Life*, Houghton Mifflin, Boston, 1978, p 514.
16 See *WIDER Study Group Series No. 4: World Economic Summits*, Helsinki, 1989.
17 'The Book of Peace', chapter 2, p 6.
18 See *Encyclopaedia Britannica: Micropedia*, I, p 707.
19 'The Book of Peace', chapter 2, p 6.
20 ibid, p 6.
21 ibid, p 6.
22 'The Book of Peace', chapter 3, p 4.
23 ibid, p 1.

Marfat.com

کتابیات

Hazrat Inayat Khan

The Complete Sayings of Hazrat Inayat Khan, Omega Publications, New Lebanon, 1978

The Complete Works of Pir-o-Murshid Hazrat Inayat Khan (original texts in five volumes): *Lectures on Sufism, 1923, Volume 1, January –June*, East–West Publications, London/The Hague, 1989

The Flower Garden of Inayat Khan, East–West Publications, London/The Hague, 1978.

The Soul, Whence and Whither?, East–West Publications, London/The Hague, 1984

The Sufi Message of Inayat Khan, Volumes I–XIII, Barrie and Jenkins, London/Servire Publishers, Katwijk, Holland, 1960–82. Revised edition: Volume II and Volume VIII, Element Books, Shaftesbury, 1991; Volume VI and Volume XIV, East–West Publications, London/The Hague, 1996

Books about Inayat Khan

Biography of Pir-o-Murshid Inayat Khan, East–West Publications, London/The Hague, 1979

Hoyack, L, *De Boodschep van Inayat Khan*, E Kluwer, Deventer

de Jong-Keesing, E, *Inayat Khan: a Biography*, East–West Publications, London/The Hague, 1974

—, *Inayat Answers*, East–West Publications, London/The Hague, 1977

Marfat.com

van Stolk, S, with D Dunlop, *Memories of a Sufi Sage: Hazrat Inayat Khan*, East – West Publications, London/The Hague, 1967

Other Sufi Writings

Arberry, A J (transl.), *Mystical Poems of Rumi*, University of Chicago Press, London, 1968

The Bustan of Saadi, Wisdom of the East Series, John Murray, London, 1911

Nicholson, R A, *The Mathnawi of Jelal-ud-Din Rumi*, E J W Gibb Memorial Series, New Series, IV, 2, Lucas, London, 1972

Poems from the Divan of Hafiz, Javidan Publications, 1963

Rehatsek, E (transl.), *The Gulistan or Rose Garden of Saadi*, George Allen & Unwin, London, 1964

General

Arberry, A J, *Introduction to the History of Sufism*, Longman, Green, London, 1942

—, *Sufism: An Account of the Mysticism of Islam*, George Allen & Unwin, London, 1950

Art Meets Science and Spirituality in a Changing Economy, SDU, The Hague, 1990

Begg, W D, *The Holy Biography of Hazrat Khwaja Muin-ud-Din Chishti*, W D Begg, Ajmer, 1960

Berendt, J E, *Nada Brahma*, East–West Publications, London/The Hague, 1988

The Bhagavadgita, New American Library, New York/Scarborough, Ontario, 1944

Capra, F, *The Turning Point*, Wildwood House, London, 1982

—, *The Tao of Physics*, Shambala, Boulder, 1975

Carus, P, *The Gospel of Buddha*, Open Court Publishing, London 1921

Chopra, Deepak, *Quantum Healing: Exploring the Frontiers of Mind/Body Medicine*, Bantam Books, New York, 1989

The Divine Songs of Zarathrustra, I J S Taraporewala (ed.), D B Taraporewala Sons and Company, Bombay, 1951

Marfat.com

Hoyack, L, 'De Wijsheid van Hermes Trismegistus', in *De Soefie Gedachte*, September 1954

Huxley, A, *The Perennial Philosophy*, Chatto & Windus, London, 1947

Kaku, M, and J Trainer, *The Cosmic Quest for the Theory of the Universe*

Khan, Murshid Musharaff, *Pages in the Life of a Sufi* (third edition), East–West Publications, London/The Hague, 1982

Kant, I, *Toward Eternal Peace*, Wereld Bibliotheek, Amsterdam, 1915

The Kybalion, Yogi Publication Society, Chicago, 1908

Lippmann, W, *The Public Philosophy*, Chatto & Windus, London, 1955

Moody, R A, *Life After Life*, Bantam Books, New York, 1975

—, *Reflections on Life After Life*, Bantam Books, New York, 1977

Murchie, G, *Music of the Spheres*, I and II, Dover Publications, New York, 1967

—, *The Seven Mysteries of Life*, Houghton Mifflin, Boston, 1978

Nawn, Munira, [writing in] *Forty Years of Sufism (Sufi Quarterly Special Issue)*, 1950

Sharib, Zahurul Hassan, *Khwaja Gharib Nawaz*, S H Muhammad Ashraf, Lahare, 1961

WIDER Study Group Series 4: World Economic Summits, Helsinki, 1989

Useful Addresses

Requests for information about the International Sufi Movement founded by Hazrat Inayat Khan to be sent to:

The General Secretariat of the Sufi Movement
Anna Paulownastraat 78
2518 BJ The Hague
The Netherlands
Telephone: 31 (0)70 346 1594
Fax: 31 (0)70 361 4864

Internet address of Sufi Center Bookstore:
http://guess.worldweb.net/sufi
E-mail address: jmccaig@worldweb.net

Marfat.com

Marfat.com

DR. H.J KARIM BAKHSH WITTEVEEN

عالمی شہرت یافتہ اقتصادی و معاشی ماہر، عالمی مالیاتی ادارے کے سابقہ مینجنگ ڈائریکٹر
اور نیدرلینڈز کے سابقہ وزیر خزانہ کی لکھی ہوئی
عالمگیر شہرت کی حامل کتاب **Universal Sufism** کا اردو ترجمہ

عالمگیر تصوف

مترجم: جمشید اقبال

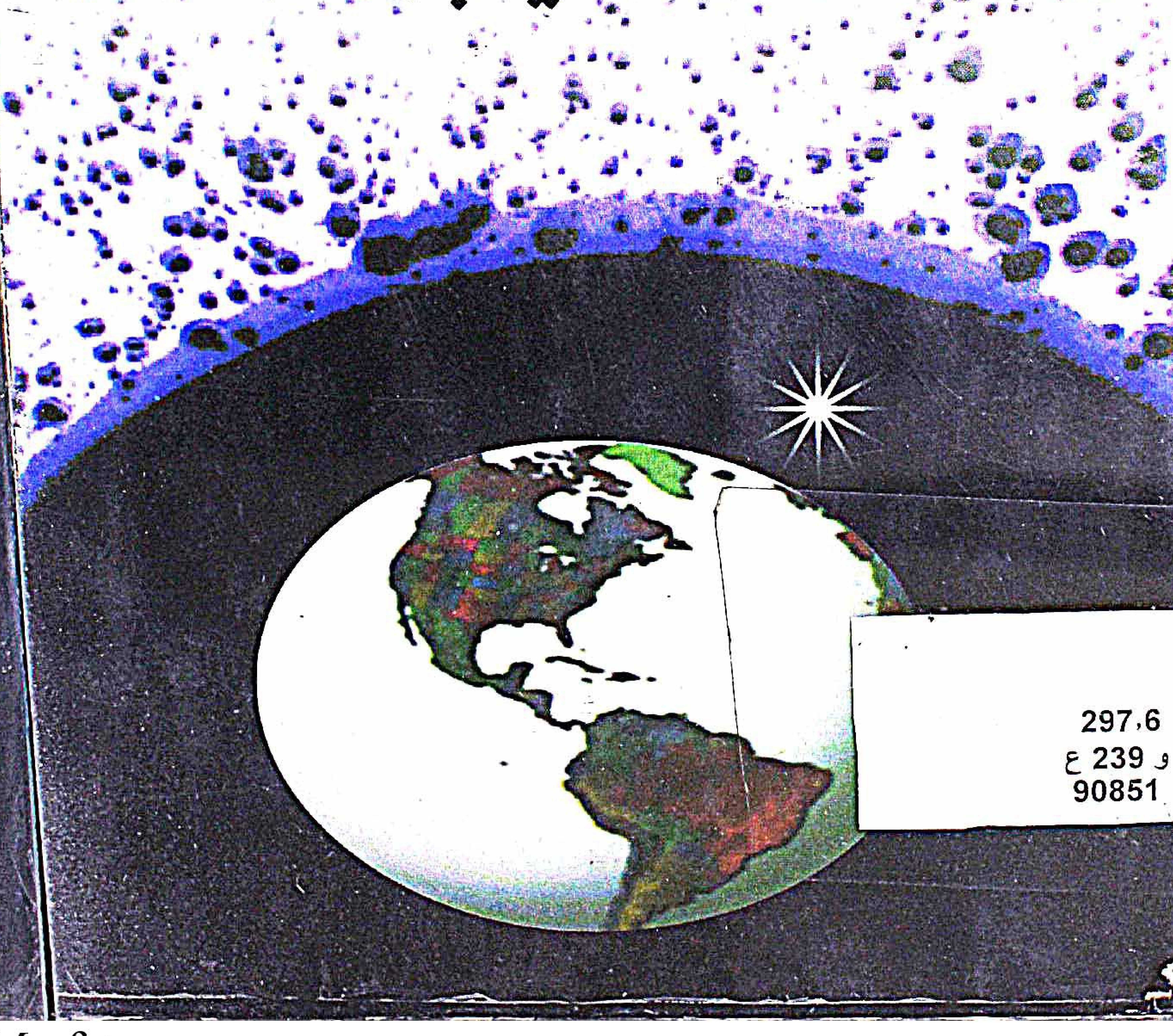

297.6
و 239 ع
90851

Marfat.com